شکستہ کنگورے

حیات اللہ انصاری

شکستہ کنگورے

آزاد کتاب گھر

کلاں محل دہلی

بار اوّل اکتوبر ۱۹۵۵

تعداد ایک ہزار

ملنے کا پتہ

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی

عنوانات
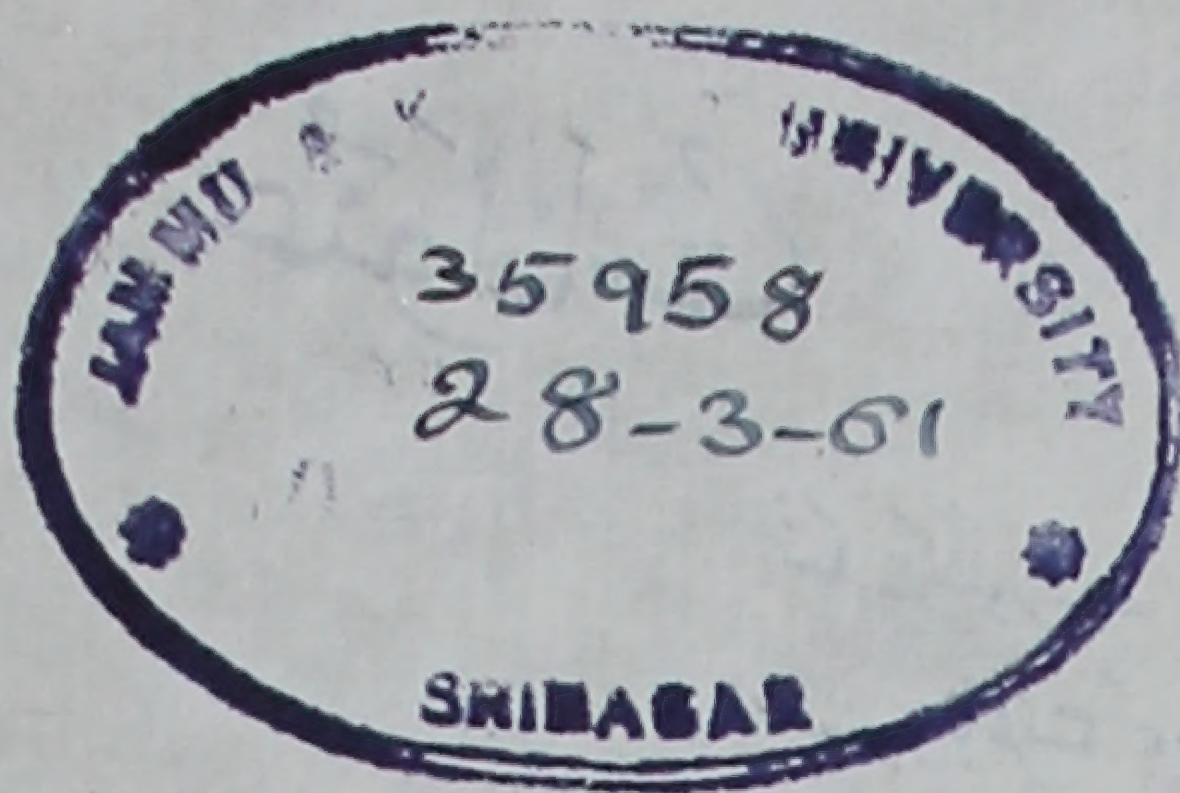
شکستہ کنگورے

(۱)

ٹن ٹن۔ ٹناٹن ٹن۔ بیل کی گھنٹیوں کی آواز بند ہو گئی۔ گاڑی سیڑھیوں کے پاس آکر رک گئی۔ منیر گاڑی پر سے کود پڑا۔

چھ سیڑھیاں چڑھ کر ایک وسیع چبوترہ تھا۔ جس پر آگے بڑھ کر منیر کا خاندانی محل تھا۔ عظیم الشان پھاٹک کے اوپر اونچے اونچے کنگورے تھے۔ جن میں سے کچھ تو ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئے تھے۔ اور کچھ بیچ سے پھٹ گئے تھے۔ جو بچ رہے تھے وہ بھی زمین کی طرف جھک آئے تھے۔ کبھی کی یہ بتیسی اب پوپلی ہو گئی تھی۔ کنگوروں کے نیچے کی کارنس میں درزیں پڑ گئی تھیں جن میں آندھیوں کی مٹی اور پانی کی کرامت سے گھاس کے جھنڈ اُگ گئے۔ رہے اور اُگ اُگ کر لوؤں سے مرجھاتے رہے۔ اب سوکھی گھاس کے پودے سو سال کی بڑھیا کے بالوں کی لٹوں کی طرح اوپر سے جھول رہے تھے

پھاٹک کے دونوں طرف کی برجیوں کی ٹوپیاں غائب ہو چکی تھیں چھتیں
خالی ہتھیلیوں کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک چھت پر ایک ٹوٹا کھمبا
کوڑھی کی کٹی انگلی کی طرح رہ گیا تھا۔ جو آسمان کی طرف اشارہ کر رہا تھا
پھاٹک کے پٹ اپنی اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ کیونکہ کندھی جن پر وہ گھومتے
تھے سڑ گل کر کبھی کی مٹی میں مل چکی تھی۔ اس وقت دونوں پٹ ٹیڑھے
میڑھے بندھے تھے۔ اور بیس آدمی مل کر بھی ان کو نہیں کھول سکتے تھے۔ مگر بند
ہونے پر جو ذرا سی دراز رہ گئی تھی وہ بھی اتنی تھی کہ ایک گھوڑے سوار
آجا سکتا تھا۔

گاڑی بان نے ریڈیو کاسٹ اور سوٹ کیس اتار کر چبوترے پر رکھا
منیر نے سہارا دے کر اپنی ماں کو اتارا۔ اور پھاٹک کے اندر آیا۔ پہلی
ڈیوڑھی طے کر کے ایک آنگن ملتا تھا۔ جس کے دونوں طرف صحنچیاں تھیں
ان میں کبھی محل دارنی رہا کرتی تھی۔ مگر اب تو داہنی طرف کی صحنچی میں محل کے
نوابی خاندان کے چراغِ سحری منیر کے دادا میاں رہتے تھے۔ منیر ان کو سلام
کرنے صحنچی میں آیا۔

یہاں ایک بڑا سالخوردہ تخت بچھا تھا اس پر بھاری ایرانی قالین
تھا جس کے روئیں اڑ گئے تھے۔ تانے بانے کے دانت نکل آئے تھے۔
تخت کے ایک طرف طلسم ہوشربا اور کرشن کانتا کی جلدیں تھیں جن کے
اوراق اتنے خستہ ہو گئے تھے کہ اٹھنے میں کٹ کٹ کر گر جاتے تھے۔ برابر
ہی جنگِ بلقان کے زمانے کے پیسہ اخبار کے فائل تھے۔ ان کے بیچ میں مدتوں
کا بجھا ہوا کنول رکھا تھا۔ کتابوں کے سامنے کمزوری دل و دماغ کی دواؤں کی
بوتلیں، ضعفِ بصارت کے سرمے اور اعصابی درد کے تیل تھے۔ بیچ میں دادا جان

ملیٹھے تھے۔ لبوں سے پیچوان لگا ہوا تھا۔ جو قریب قریب جل چکا تھا۔ آنکھوں پر پتھر کی عینک تھی۔ جس کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے ان کی آنکھیں اصل سے زیادہ بڑی نظر آ رہی تھیں۔ مگر ان موٹے موٹے شیشوں کے نمبر بھی اب پرانے ہو چکے تھے۔

اپنے اکلوتے پوتے کی تسلیم سن کر دادا میاں کے دھلے کپڑے کے ایسے سفید چہرے پر چند شہابی چھینٹیں آ گئیں۔ خوش ہو کر کہنے لگے۔

"ارے میرا منبر آ گیا — ادھر آ — ادھر آ۔"

دادا میاں نے منبر کو زور سے کلیجہ سے لگا لیا۔ مگر ان ہاتھوں میں زور ہی کتنا تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ اس لئے دادا میاں کی کمزور آنکھوں کو منبر کا چہرہ نظر نہ آیا۔ انہوں نے پیار سے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے ابھی سات ہی آٹھ برس کا بچّہ ہے۔

"کیوں بیٹا۔ بی۔ اے کا امتحان دے آئے؟"

"جی ہاں دادا میاں۔ پاس ہو گیا۔"

"الحمدللہ — خدا کرے ڈپٹی ہو!"

دادا میاں کے چہرے پر خوشی کی چمک آ گئی۔ پھر فوراً ہی افسردگی کی ایک موٹی سی نقاب اُتر گئی۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جو محل کی دیواروں اور شکستہ کنگوروں میں جذب ہو گئی۔ اس سانس نے منبر کو وہ دن یاد دلائے جب پھاٹک کے سامنے بھاگوان ہتھنی جھومتی تھی۔ مصاحبوں، کارندوں اور مہمانوں کے پرے کے پرے گزرتے رہتے تھے پھر ابا جان کی بیماری، مقدمہ، پیروی کی کمی اور کارندوں کی دغابازی سے علاقے کا نکل جانا۔ ابا کی بیماری کا طول۔ گھر کے جواہرات کا بکنا۔ آخر میں

اُن کی موت۔

دادا میاں کی یہ کبھی کبھی کی ٹھنڈی آہیں منیر کے سینے میں جاکر زبردست ارادوں کی شکل اختیار کرلیتی تھیں۔ کہ جیسے بھی بنے اپنی گزشتہ شان و شوکت واپس لاؤں گا۔ اگر اسی پھاٹک پر پھر ہاتھی نہ جھوما تو زندگی کس کام کی۔ یہ عروج تو اپنا حق ہے۔

منیر دانتوں میں اپنا ہونٹ چبانے لگا۔

"دادا میاں، آپ کا مزاج تو اچھا رہا؟"

دادا میاں یہ سن کر خوش ہو گئے۔ کہ اپنا ایک پوچھنے والا تو ہے۔

"میرا مزاج۔۔۔۔ بس تمہارا عروج دیکھنے کو زندہ ہوں؟"

"عروج" منیر کے دل نے دبی زبان سے کہا۔

پھر دادا میاں نے اپنے خادم کو پکارا۔

"ارے شوکت۔"

دادا میاں کی صحنچی کے سامنے کی صحنچی میں شوکت رہتا تھا منیر کے لئے یہ بات ہمیشہ معمہ رہی کہ دادا میاں زیادہ بڈھے ہیں یا شوکت۔ شوکت کا چہرہ جھریوں کا گچھا تھا۔ منہ پوپلا تھا۔ کمر جھک گئی تھی۔ مگر جوانی میں ڈنڑ جو کئے تھے تو چھاتا ابھی تک تنا ہوا تھا۔ کان اور آنکھیں کام دیتی تھیں۔ ہاں ہاتھ پاؤں جواب دے رہے تھے۔ دادا میاں کا جیسا جیسا سن آتا جاتا تھا۔ اپنے شوکت کا زیادہ خیال کرتے جاتے تھے۔ اب تو یہ حالت تھی کہ اگر سیر بھر گھی ان کے لئے آئے تو شوکت کا حصہ آدھ چھٹانک سے تو ہو سکتا تھا۔ مگر سات نہیں۔ شاید ایسا اس وجہ سے ہوتا تھا کہ ان کے بڑھاپے کی لاٹھی وہی تھا۔ سوچتے ہوں گے، یہ نہ رہا تو بے

سہارا ہو جاؤں گا۔
شوکت لاٹھی ٹیکتا ہوا سامنے آیا۔ دادا میاں نے پوچھا۔
"کیوں شوکت۔ دیوان خانہ اور شہ نشین صاف کرا دیئے؟"
"جی سرکار۔ حکم کی تعمیل ہو گئی؟"
"بیٹا منیر اب تم شہ نشین اور دیوان خانہ آباد کرو۔ تمہارے باپ دادا کی جگہ ہے۔ میری عین خوشی ہے۔"
"بہتر ہے۔ جیسا حکم ہو۔"
"اچھا بیٹا اب جاؤ۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ تم کو دیکھ کر میری جوانی لوٹ آئی ہے؟"
منیر جیسے ہی ڈیوڑھی کے باہر آیا۔ آوازیں آنے لگیں۔
"بھیا سلام"
"بھیا سلام"
"بھیا سلام"
"بھیا سلام"
دیوار سے لگے ہوئے بہت سے کسان۔ بڈھے۔ عورتیں اور بچے کھڑے تھے۔ شام کی ملگجی روشنی میں سب مل جل کر کوڑے کا ایک ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ چیتھڑا اوڑھنیاں۔ میلی کثیف دھوتیاں۔ پھٹے پھٹے پاؤں۔ الجھی الجھی لٹیں۔ کھردرے ہاتھ اور گال۔ پپڑی پڑے ہوئے ہونٹ۔ فاقہ زدہ آنکھیں۔ یہ منیر کی خاندانی رعایا تھی۔ جو نوجوان ولی عہد کی آمد سن کر اکٹھا ہو گئی تھی۔ پندرہ برس ہوئے علاقے کے ساتھ یہ لوگ بھی قبضہ سے نکل گئے تھے۔ مگر ان کی وفاداری ابھی تک اسی خاندان کا دم

دم بھرے جا رہی تھی۔

مینر نے ایک ایک کی خیریت پوچھی۔

"کہو بدلو اچھے تو رہے؟"

"ہاں سرکار اچھے رہے۔"

"رسولن تو کیسی ہے؟"

"بھیا اچھی ہوں۔"

"تو کیسی ہے بھگی؟"

"اچھی ہوں بھیّا۔"

"اہو ہو۔ بیوا ہے۔ اچھا تو ہے تو؟"

"ہاں بھیا اچھا ہوں۔"

اچھے سب بھلے کھانستے ہوئے بڈھے۔ سوکھے کے مارے بچے۔ مدقوق عورتیں۔ جھنیھڑا اور ڈھنیاں۔ پپڑی پڑے ہوئے ہونٹ پھٹے ہوئے پاؤں فاقہ زدہ آنکھیں۔ سب اچھی تھیں۔ بالکل اچھی۔

اَبکی کھیتی کیسی ہوئی بدلو؟"

"کھیتی کہاں سرکار۔ بیل تو مر گئے۔"

"چہ چہ چہ۔ چھبدا کام پر جاتا ہے؟"

"اس کا تو مہینن سے جوڑی آوت ہے۔"

"اس کی بیوی کیسی ہے؟ آئی نہیں۔"

"زچہ کھانے میں پڑی پڑی کھانست ہے۔"

"اور تو سب اچھا ہے؟"

"سب اچھا ہے سرکار۔"

منیر نے روپے گے پیسے جو بھنا کر رکھ لیئے تھے، نکالے ہتھیلی دیکھ کر سب کی آنکھیں جگمگا اٹھیں. جیسے گھورے کی جھاڑی میں سرخ بونڈ یاں۔ منیر نے ایک ایک پیسہ بچوں کو بانٹا. پیسہ پا کر ان کے بڑے بڑے دانت نکل آئے. ان کے دانتوں کو دیکھ کر ماں باپ کے دانت بھی نکل پڑے۔ کیوں نہ نکلتے؟ ایسی اچھوتی خوشی اپنے بچوں کو کہیں برسوں میں جا کر نصیب ہوتی ہے۔

ابھی پارسال تک ان کی خوشی دیکھ کر منیر کے دانت بھی نکل پڑتے تھے. تب تک وہ سمجھتا تھا کہ اس سمندر میں ایک ایک پیسہ ڈال کر میں اس کے کھاری پن کو میٹھا کر دیتا ہوں.

رات کو منیر شہ نشین پر سونے کے لیئے لیٹا تو اماں جیسا کہ معمول تھا اس کے سر میں تیل دبانے لگیں۔ مگر منیر فوراً نہیں سو گیا. آج دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔ جنہوں نے نیند چرا لی تھی. سوچتے سوچتے کہنے لگا۔

"...... ریشمی پردے تو ویسے ہی لگنا چاہییں...."

منیر اپنی ماں سے اسی طرح بیچ سے بات شروع کرتا تھا اور وہ بھی بلا کسی کوشش کے اپنے اکلوتے بیٹے کے خیالات کا بہاؤ پکڑ لیتی تھیں. بولیں "ان پردوں کا کیا کہنا! تمہارے پردادا نے اللہ بہشت نصیب کرے دو ہزار میں خریدے تھے۔"

"مگر اماں جوکوں کے فرش کی جگہ اب کوچ ہوں. اور..."

منیر جوش سے اٹھ بیٹھا. اور دیوان خانے کے صدر دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

"اس جگہ دونوں بیل پایوں کے برابر گنگا جمنی لگلے ہوں۔ جن میں سدا بہار پودے ہوں۔ ان کے بیچ میں بڑا سا دیوان ہو جس پر کوہ قاف کے سمور کا فرش اور ہنس کے پروں کے گدے ہوں۔ مگر اماں میں تو گدوں میں لچکے کی جھالر لگواؤں گا۔ چاہے نئے خیال کے لوگ ہنسیں"
"لچکے کی جھالر ضرور۔ ہو بیٹا۔ جتنی مشرقی میری بہو آئے گی اتنا ہی مشرقی میرے بیٹے کا دیوان خانہ ہونا چاہیے۔"
ماں اور منیر دونوں کی نظریں اک ساتھ گلابی بالاخانے کی طرف اٹھ گئیں۔ جس کی سنگ مرمر کی جلمنوں سے خودرو بیلیں سہرے کی طرح جھول رہی تھیں۔
ماں۔ کب میری بہو آئے اور کب یہ گلابی بالاخانہ آباد ہو۔ بچارا کب سے اس کے سپنے دیکھ رہا ہے؟
منیر آنکھیں بند کر کے میٹھے میٹھے خیالوں کے مزے لینے لگا۔
اک دم سے سر اٹھا کر منیر نے پوچھا۔
"اماں۔ وہ کتاب کہاں رکھی ہے؟"
منیر اپنے ساتھ نہ لایا ہوگا تو کوئی پچاس کتابیں تو لایا ہوگا۔ مگر اماں فوراً سمجھ گئیں کہ کس کتاب کو پوچھ رہا ہے۔
"وہ تو میرے کپڑوں کے بکس میں رکھی ہوئی ہے۔"
منیر نے ذرا خوشامد سے کہا۔
"اے اماں۔ اسی وقت نکالئے۔"
اماں کی خوشی ہمیشہ وہی ہوتی تھی جو بیٹے کی۔ انہوں نے کہا "اماں ہاں" اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ماں بیٹے دونوں لالٹین لے کر بڑے بڑے

خالی کمروں اور دالانوں سے گزر کر جہاں صندوق تھا وہاں پہنچے۔ ماں نے ایک ایک کر کے تمام چیزیں صندوق سے نکالیں۔ پھر ایک بڑی کتاب نکال کر منیر کو دی۔

یہ کتاب تصویروں کی ایک فہرست تھی جس میں نمو نے چھپے ہوئے تھے۔ بشہ نشین پر آکر منیر نے ایک تصویر نکال کر اماں کو دکھائی۔

"یہ نپولین کی تصویر ذرا دیکھو اماں ـــــ کیسا شاندار معلوم ہوتا ہے ـــــ ہے نا؟ یہ تصویر منگواؤں گا۔ چھ فٹ لمبی چار فٹ چوڑی وہاں دیوان خانے کے بیچوں بیچ میں لگواؤں گا۔"

منیر تصویر دکھا کر لیٹ گیا۔ دیر کے بعد دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"ذرا سا سہارا پا کر ان لوگوں کی آنکھیں ایسی چمکنے لگتی ہیں۔"

ماں فوراً سمجھ گئی کہ غریب رعایا کا تذکرہ ہے۔ منیر نے پیسے بھلائے تھے۔ بانٹے ہوں گے۔ کہنے لگیں۔

"ہاں بیٹا غریبوں کا خیال کرنا چاہیئے۔ بھلا کر۔ تیرا بھلا ہوگا۔"

اماں کی انگلیوں سے سر میں مزیدار گدگدی ہونے لگی۔ آنکھیں بند ہوگئیں۔ منیر سو گیا۔

(۲)

منیر کو ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ آندھیاں چلنے لگیں۔ یہ آندھیاں شہر کی کوٹھیوں کی آندھیاں نہ تھیں۔ کہ ادھر افق پر غبار آیا اور ادھر ڈرائینگ روم کے دروازے بند کر لئے۔ قمقمے روشن ہوگئے۔ پنکھے رقص کرنے لگے۔ یہ آندھیاں تھیں دیہاتوں کی۔ دھول کے پہاڑ اٹھتے گاؤں کی کھوپڑی پر وحشیانہ رقص کرتے اور گھروں اور دکانوں

میں گھس گھس کر پناہ لینے والوں کو پامال کرتے۔ باغوں میں ٹہنے پھٹ پھٹ جاتے اور تنا ور درخت جڑ سے اکھڑ جاتے۔

ایسی ہی ایک آندھی میں بدلو کا چھپر اڑ گیا۔ ایسا اڑا کہ تنکا تنکا بکھر گیا۔ اس ایک واقعے نے میٹر کو کسانوں کی سبھا میں لا پھانسا۔ وہ یوں کہ برسات تھی سر پر بدلو نے گھبرا کر پنچایت کے میدان سے جو سب کا سمجھا جاتا پھونس کاٹ لیا۔ اس پھونس نے بڑی آگ لگائی۔ پہلے تو بدلو اور ایک کسان میں مار کٹائی ہوئی۔ پھر سارے کسان آدھے ادھر اور آدھے ادھر ہو گئے۔ میدان کا پھونس کس کا ہے۔ یہ فیصلہ لاٹھی پر چھوٹا۔ اس جج نے ابھی زبان نہیں ہلائی تھی کہ زمیندار صاحب تشریف لے آئے اس کو ڈانٹا۔ اس پر بگڑے۔ اس کو برا بھلا کہا۔ اس کو سمجھایا۔ فیصلہ یہ کیا کہ میں دیکھ لوں گا۔ کون ضرورت مند ہے۔ اور اسی کو پھونس ملے گا۔

کسان بھولے ہوتے ہیں۔ مگر اتنے بھی نہیں کہ زمیندار کا فیصلہ نہ سمجھتے۔ جان گئے کہ اس نے پھونس پر اس بہانے قبضہ جما لیا۔ پھر تو سب پھونس واپس لینے اپنی سبھا کے جھنڈے کے نیچے ایک ہو گئے۔

بدلو نے بہت خوشامد کر کے میٹر کو سبھا کے سامنے اپنا وکیل بنا کر کھڑا کیا تھا۔ اس دلدل میں جو اس کا پاؤں پڑا تو دھنستا ہی گیا۔ ایک معاملے کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا آتا گیا۔ اور وہ ہر ایک کے حل کرنے میں حصہ لیتا رہا۔

(۳)

جلسے میں خون بھری لاٹھیاں بھی تھیں اور زخمی سر بھی۔ ٹوٹے ہاتھ بھی اور گھائل دل بھی۔ جوان عورتیں رو رہی تھیں۔ اور بوڑھیاں کوس رہی

رہی تھیں۔ دودھ پیتے بچے ماؤں کی گودوں میں بسور رہے تھے اور بڑے بچے سہمی نظروں سے آپس کے فساد کی غارتگری دیکھ رہے تھے۔

اس بے قاعدہ جلسے میں کسان سبھا کے سب سے بڑے لیڈر سوامی جی مہاراج کی ایک تقریر ہو چکی تھی۔ اس سے فریقین کا جوش ذرا ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ جب منیر پہنچا تو سوامی جی نے کہا:۔

"بھیا منیر آپ بھی ایک تقریر کر دیجیۓ۔"

"لڑائی ہوئی کس بات پر؟"

"لڑائی کا کیا۔ ہوا ہی کرتی ہے کسانوں میں۔"

"سوامی جی ذرا بات تو معلوم ہو جائے۔ کیوں بدلو کیا ہوا؟"

بدلو کے چہرے پر بھی ایک چپیٹ آگئی تھی۔ ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی اور گال سرخ تھا۔

"نہر سے کھیت سینچنے پر"۔

"کیوں تم لوگ باری باری نہیں سینچتے ہو؟" منیر نے پوچھا

سوامی جی بولے۔ "یہی بات تو ان مورکھوں کی سمجھ میں نہیں آتی ہے ان کو چاہیۓ ......"

سوامی جی پانچ منٹ تک کسانوں کو سمجھاتے رہے۔ کہ تم کو یہ چاہیۓ تم کو وہ چاہیۓ۔ تقریر ختم کر کے انہوں نے پھر منیر سے تقریر کی فرمائش کی۔

"سنئے تو سوامی جی اگر نہر کا پانی سب کے لئے کافی نہیں ہوتا تو محکمہ سے کہا جائے کہ پانی بڑھائے۔" منیر نے کہا۔

سوامی جی نے اپنے پھیلے ہوئے کپڑے ذرا سمیٹے اور گھنی بھوؤں کو ذرا خم دے کر کہنے لگے۔

"اتنی بڑی نہر کاٹی ہے۔"
مجمع سے ایک زخمی نے پکار کر کہا۔
"مگر ہم کو تو وہی ایک قلابہ ملتا ہے۔ باری باری سینچیں تو فصل ختم ہو جائے اور پانی نہ ملے۔"
سوامی جی نے بھرے جلسے کے اندر سے بولنے والے کو کڑے تیوروں سے دیکھ کر ملائم لہجے میں کہا۔
"تو کیا ہرج ہے بابا۔ پانی تمہارے کھیت کو نہ ملا تمہارے بھائی کو مل گیا۔"
مینر نے بھرے جلسے میں بولنے والے زخمی سے پوچھا۔
"ایک قلابہ! اور سب پانی کہاں ہوتا ہے؟"
"رانی صاحب کے باغ کو جاتا ہے۔"
سوامی جی کے لہجے میں ذرا کڑواپن آ گیا۔ بولے۔
"تم لوگ بڑے احسان فراموش ہو۔ رانی صاحبہ نے تم پر کیسے کیسے احسان کئے ہیں پھر بھی ان کی شکایت! ابھی پارسال....."
مینر کو سوامی جی کی خفگی سمجھ میں نہ آئی۔ کہنے لگا۔
"نہر تو دھان اور ایکھ کے لئے ہے۔ ان سے بچے تو باغوں کو جائے۔ پہلے پانی کھیتوں کو ملنا چاہیے۔"
یہ سنتے ہی جلسے میں جھرجھری آ گئی۔ بھیا۔ ہاں بھیا۔ کے نعرے لگنے لگے۔ زخمی اس طرح پکار اٹھے گویا یہی ان کا مرہم ہے۔ جو بیٹھے تھے کھڑے ہو گئے۔ جو کھڑے تھے قریب آ گئے۔ جوش میں دھکم دھکا ہونے لگی۔

سوامی جی جلسے کا رنگ اکھڑتے دیکھ کر چکرا گئے۔ پھر سنبھل کر کہنے لگے۔

"تم لوگوں کا منشا ہے کہ رانی صاحبہ سے جھگڑا مول لیا جائے —— اچھا— سوامی بھی پیچھے رہنے والا نہیں ہے — مگر یہ سمجھ لو کہ ان کے کارندے ایک حرامزادے ہیں۔"

منیر نے کہا۔ "تو کیا حرامزادوں سے ڈر کر اپنا حق چھوڑ دیا جائے؟"

سوامی جی بات بنا کر کہنے لگے۔

"ہاں ہاں۔ میں کب کہتا ہوں کہ اپنا حق چھوڑا جائے۔ ضرور لینا چاہیئے اپنا حق— ہاں — ذرا رانی صاحبہ سے بات چیت ہو جائے تو اچھا ہے"

"بات چیت ہو تو نہر کے محکمے سے ہو۔ لیکن ہاں اگر آپ رانی صاحبہ کو خبر دینا چاہتے ہیں تو کیا برا ہے۔ مل لیجئے۔" منیر نے کہا۔

مجمع سے دو تین زخمی بول اٹھے۔

"تم بھی جاؤ بھیّا۔"

سوامی جی جھٹ بول اٹھے۔

"تم لوگوں کی رائے ہیں دو آدمیوں کو جانا چاہیئے۔ بات تو ٹھیک ہے۔ زیادہ آدمی جائیں گے تو زیادہ اثر پڑے گا۔" "اچھا تو پنڈت جی میرے ساتھ جائیں گے۔"

منیر کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ سوامی جی کیوں ہر بات کو گول گول کر دیتے ہیں۔ مگر اس تجویز میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ اس لئے وہ بولا۔

"کوئی بھی جائے۔ خبر ہی تو دینا ہے۔ پانی تو آج ہی سے کھیتوں کو دیا جائے گا۔"

سوامی جی نے عینک صاف کرکے پھر سے آنکھ پر لگائی اور بولے "ہاں منیر صاحب تم بھی کیوں نہ چلے چلو۔"

چلنے کا وقت دو بجے طے ہوا تھا۔ دو کے تین بجے۔ تین کے چار منیر سوامی جی کے باہر والے چھپر میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ سوامی جی اور پنڈت جی ہیں کہ نہ اب تیار ہو چکتے ہیں نہ جب۔ کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آتا ہے۔ اب یہ آن پڑی کہ سہ پہر ہو چکی تھی۔ بھلا کیسے ممکن تھا۔ کہ سوامی جی منیر کو چائے پلائے بغیر چل کھڑے ہوں۔ لٹیا میں چائے بن کر آئی تو آبخورہ نہ تھا۔ جب تک آبخورہ آئے آئے۔ چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ منیر کو بڑی فکر تھی کہ دو کوس پیدل جانا ہے اور پھر واپس آنا ہے دیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ساڑھے پانچ بجے کے قریب سوامی جی کے مکان کے سامنے کچی سڑک پر آکر ایک کار رکی۔ چوبدار نے آکر سلام کیا۔ اور کہا۔ "سوامی جی مہاراج۔ رانی صاحبہ نے آپ کے لئے کار بھیجی ہے۔"

سوامی جی بڑی پھرتی سے کھڑے ہو گئے۔

"بھیا منیر اب چائے رانی صاحبہ کے ہاں پئیں گے۔ یہاں گرم ہوتے ہوتے ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔"

منیر کے نوجوان پیروں سے زیادہ سوامی جی اور پنڈت جی کے پیروں نے پھرتی دکھائی۔ جب دونوں کار میں بیٹھ لئے ہیں تب منیر اندر پہنچا۔ کار چل کھڑی ہوئی۔

اخلاق بھی دنیا میں عجیب چیز ہے! . . . . . دشمن کو بھی دوست

بنا لیتا ہے" سوامی جی نے کہا۔

سوامی جی کا اخلاق پر لیکچر منیر نے غور سے سنا۔ سوامی جی نے دیا سلائی جلا کر بیڑی سلگائی۔ بولے۔

"کیوں پنڈت جی! یوں تو رانی صاحبہ سب ہی کا خیال کرتی ہیں مگر کسان سبھا والوں کا خاص خیال کرتی ہیں؟"

جی ہاں سوامی جی ۔۔ اب دیکھئے یہ کار ۔۔"

سوامی جی نے جلدی سے پنڈت جی کی بات کاٹ کر خود پوری کر دی "بلا مانگے بھیجدی ۔۔ خبر پہنچ گئی ہوگی کہ ہم لوگ آنے والے ہیں۔ دیکھو ذرا رانی صاحبہ کا اخلاق۔ اس مرتبہ سبھا کے اجلاس کے موقع پر۔۔۔۔"

رانی صاحبہ کے حسنِ اخلاق کی تعریف سن کر منیر بچوں کی طرح خوش ہو کر کہنے لگا۔

تب نورانی صاحبہ خود ہی سب پانی دے دیں گی"۔

بیڑی دفعتہً بجھ گئی۔ سوامی جی نے گردن گھما کر باہر پھینک دی ان کو خاموش پا کر منیر پنڈت جی کی طرف مڑا۔ ان کی نگاہ آس پاس کے کھیتوں کو پھلانگتی ہوئی دور نہر تک جا رہی تھی۔ پھر راستے بھر کوئی بات نہ ہوئی۔

ریاست کے منیجر نے مہمانوں کو بہت آؤ بھگت سے اتارا۔ جب منیر ہاتھ منہ دھو کر مہمان خانے میں کوچ پر آ کر بیٹھا تو اس کے سامنے چائے آئی۔ سونے کا سٹ۔ بڑا کیک۔ ہنٹلے پامر کے سگر بسکٹ۔ تین قسم کے حلوے۔ چار قسم کے مربے۔ خشک میوے پھل۔ اولٹین کا ڈبہ۔

اور گلوکوز کی شکر۔ مینر نے دو بسکٹ کھا کر ایک پیالی چائے پی لی۔ مینجر گڑگڑا کر کہنے لگا۔

"کوئی اور چیز! یہ چیزیں پسند نہ ہوں تو جو فرمایئے وہ منگوا دیا جائے"

مینر کے منہ سے ابھی کچھ نکلا نہیں تھا کہ سوامی جی جو دو دو میٹھے لڈو پر لڈو حلق میں اتار رہے تھے لے اڑے۔

"مینر صاحب کے لئے انڈے منگوایئے۔ یہ نئے زمانے کے ہیں"

مینجر فرمائش پوری کرنے خود دوڑ گیا۔ مینر نے ذرا بے چینی سے کہا۔

"سوامی جی میں اس وقت صرف چائے پیتا ہوں"

سوامی جی نے بزرگانہ نصیحت کی۔

"بیٹیا اب تم سبھا کا کام کرنے لگے ہو — یہی کرنا ہے — بہت اچھی بات ہے۔ مگر زندہ بھی تو رہنا ہے۔ ایسی بے غرضی چھوڑ دو"

مینر سوامی جی کے موتی چور لڈوؤں سے بھرے ہوئے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سبھا میں کام کرنے اور زندہ رہنے کے لئے سہ پہر کو انڈا کھانا کیوں ضروری ہے۔

ابھی مینر نے انڈا ختم نہیں کیا تھا کہ سوامی جی بول اٹھے۔

"یار مینجر صاحب۔ مینر بھیا کے لئے کوئی بڑھیا سگریٹ لاؤ"

مینجر نے لپک کر میز پر سے مصری سگریٹ کا ڈبہ اٹھایا۔ اور کھول کر مینر کی طرف بڑھایا۔ اتنی مستعد اور خلاف توقع مہمان نوازی سے مینر ذرا گھبرا گیا تھا۔ نکالنے میں سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ جھک کر قالین پر سے اٹھانے لگا تو مینجر نے ادب سے کہا۔

"دوسرا لیجیئے!"

دور سے سوامی جی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "ہاں ہاں وہ تو میلا ہوگیا ہے۔"

منیر انتظار کرتے کرتے گھبرا گیا۔ نہ تو سوامی جی جو پانچ منٹ کے لئے کسی ضروری کام سے گئے تھے واپس آئے ہیں۔ اور نہ رانی صاحبہ کے یہاں سے بلاوا آتا ہے۔ منیر ٹہل رہا تھا۔ اور گھڑی کی طرف تک رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی تھی کہ جمی جاتی تھی۔ پہلے منیر کے ایک چکر پر اس میں ڈھائی منٹ ہوتے تھے۔ اب صرف ایک۔

ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد چوبدار آیا۔

سوامی جی مہاراج رانی صاحبہ کے یہاں ہیں۔ آپ دونوں کو بلا رہے ہیں۔"

منیر کو ذرا تعجب ہوا کہ سوامی جی وہاں کیسے پہنچ گئے۔ پھر دل میں کہنے لگا۔ شاید کام سے فارغ ہو کر ان کو خیال آیا ہوگا کہ ہم لوگ وہاں پہنچ گئے ہوں گے۔"

رانی صاحبہ بیوہ تھیں اور سن سے اتر چکی تھیں۔ مگر ابھی تک بناؤ سنگھار نہیں چھوڑا تھا۔ پیازی رنگ کی بھاری بنارسی ساری۔ مرصع پنج لڑا ہار اور جڑاؤ جہانگیریوں سے اس وقت بھی سجی ہوئی تھیں مخملی کوچ پر کار چوبی تکیے کا سہارا لئے لیٹی تھیں۔ شکر پی رہی تھیں۔ ذرا دور پر نیم آرام کرسی پر سوامی جی مہاراج بیٹھے تھے۔ ان کی گیرو ی دھوتی کی ایک ایک شکن ترتیب سے تھی چہرہ بالکل مطمئن۔ اس پر گویا سنگ آدمی نہیں پتھر کے بت معلوم ہوتے تھے۔

رانی صاحبہ نے منیر کو بزرگانہ دعا دی۔ دادا میاں کی خیریت پوچھی۔ پھر کہنے لگیں۔

"بیٹا بڑے موقع سے آگئے۔ میرا ایک کام کر دو تو بڑا احسان ہو تمہارے دادا میاں کی راجہ صاحب سورگباشی بہت عزت کرتے تھے مگر میں بیاہ کے آئی بھی اور بیوہ بھی ہو گئی۔ مگر ابھی تک ان کے سلام کو نہیں گئی۔ اس کی مجھے بہت شرمندگی ہے۔ تم میری طرف سے ان کو ایک حقیر نذر پیش کر دو۔ وہ انہوں نے قبول کر لی تو میں سمجھوں گی کہ میرا قصور معاف ہو گیا۔ تمہارے گاؤں کی طرف ہم نے دو سو باغ لگوائے ہیں۔ ان میں سے جونسا بھی تم پسند کرو ان کے نذر کر دو۔"

منیر رانی صاحبہ کے اخلاق سے بہت متأثر ہوا اور کہنے لگا۔

"میں آپ کا پیغام ضرور پہنچا دوں گا — مگر رانی صاحبہ اس وقت تو ہم لوگ خاص غرض سے آئے ہیں۔"

رانی صاحبہ نے سنک کا ایک کش کھینچا۔ چلم کے نیچے چھپی ہوئی آگ چمک اٹھی۔ ذرا دیر کے بعد رانی صاحبہ کہنے لگیں:-

"میں موئی ان باغوں کو لگا کر پچھتاتی ہوں۔ کہتی ہوں چار لاکھ کا نقصان ہوا ہوا۔ سوکھ جائیں۔ چھٹکارہ ملے۔ مگر یہ سوامی جی کہتے ہیں کہ اس سے گاؤں والوں کا نقصان ہو گا۔"

سوامی جی نے فوراً تائید کی۔

"بڑا نقصان ہو گا۔ کتنے بچارے ہیں جو وہاں روزگار سے لگے ہوئے ہیں۔"

رانی صاحبہ بولیں۔ "یہی تو بات ہے مگر یہ بھی تو اچھا نہیں کہ گاؤں والوں کو پانی نہ ملے۔ ہم ٹھہرے ان کے مائی باپ۔"

"یہی تو باتیں ہیں آپ کی جس سے رعایا آپ کا دم بھرتی ہے!"

پنڈت جی نے سنسکرت کی ایک چوپائی پڑھی۔ سوامی جی نے اس پر گردن ہلائی۔ رانی صاحبہ منیجر کی طرف مڑیں۔ ان کے بیچ لڑے ہار کے پھول، کنول کی روشنی میں جگمگا اٹھے۔

"کسانوں کا خیال بھلا ہم نہ کریں ـــ وہ ٹھہرے ہمارا پانی تکنے والے لوگ۔ ۔ ۔ ۔"

رانی صاحبہ چپ ہوگئیں پاس رکھی ہوئی گھڑی سرگوشیاں کرتی رہی۔ ٹِک ٹِک۔ ٹِک ٹِک۔

منیجر کے دل پر سے بڑا بوجھ اتر گیا۔ کہ رانی صاحبہ سے بے مروتی کرنے کی ضرورت نہیں پڑی، خاندانی مراسم کی لاج رہ گئی اور نہر کا سب پانی ہاتھ آگیا۔

رانی صاحبہ ایک کش لے کر کہنے لگیں۔

"آپ لوگ ایک قلابہ اور مانگتے ہیں۔ میں کہتی ہوں ایک کم ہے دو اور دے دیجئے۔"

رانی صاحبہ نے منہ سے پچھلے کش کا دھواں چھوڑا۔ سوامی جی اور پنڈت جی رانی صاحبہ کی دیا سے خوش ہو گئے۔ منیجر بے چینی سے کل بدلنے لگا۔ جیسے کرسی پر سوئیاں چبھی ہوں۔ آخر جی کڑا کر کے بولا۔

"مگر ہم تو سارا پانی لینے آئے ہیں!"

"واہ بیٹا! تمہارا مطلب یہ ہے کہ تمہارے دو سو باغ سوکھ جائیں"
"آپ نہر کی دوسری شاخ نکلوا لیجیے۔"
"کاش یہ ممکن ہوتا۔ تم تو قوم پرور ہو۔ جانتے ہو یہاں انگریزوں کا راج ہے۔ نہر پر اوپر چڑھ کر کسی انگریز کا فارم ہے۔ وہ اپنی زمین پر سے نہر نہیں نکلنے دیتا ہے۔ میں نے جانے کتنا روپیہ اس سلسلے میں پھونک ڈالا۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ بھلا انگریز کے سامنے ہم ہندوستانیوں کی چل سکتی ہے؟"
"تو پھر کنوئیں بنوا لیجیے۔"
رانی صاحبہ زور سے قہقہہ مار کر ہنسیں۔
"کیسا بھولا بچہ ہے۔ نہ ہوں تو دو سو پختہ کنوئیں تو ہوں۔ پھر بیل کی گوئیاں ہوں۔ دو ڈھائی لاکھ کا خرچ ہے۔"
"مگر سنیے نورانی صاحبہ۔ نہر کا پانی لینا تو کسانوں کی حق تلفی ہے۔"
رانی صاحبہ نے اور بڑا قہقہہ لگایا۔ ان کی مصنوعی ہنسی کھل گئی۔
"حق تلفی! بیٹا افسوس! تم اچھے ہی تھے جب تمہارا علاقہ نکل گیا۔"
"حق تلفی"
رانی صاحبہ پھر ہنس پڑیں۔
"منیجر صاحب چاہیے تو یہ کہ کاشتکار سے کام لو تو اسے چھ آنے روز دو۔" سوامی جی نے منیجر کو سمجھایا۔
"مگر ہم تم دونوں اس سے بیگار لیتے ہیں۔ یہ حق تلفی نہیں تو اور کیا ہے؟"
منیجر کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ دماغ میں کپکپی آئی اور پھر ایسا

معلوم ہوا جیسے دماغ کی بال کمانی نکل گئی۔ اور مشینری تیز رفتاری سے چلنے لگی۔

"بیگار! ہاں بیگار تو لیا جاتا ہے — سیر ہی تو رہ گئی ہے۔ بلا بیگار کے کیسے کام چلے! — چلے یا نہ چلے یہ بند — اماں بھی مان جائینگی اور رواداریاں بھی۔ فاقے ہوں بلا سے — نہ مانیں گے تو دو وقتوں کے لئے کھانا چھوڑ دوں گا — تب تو مان جائیں گے۔"

مینر کی خاموشی دیکھ کر رانی صاحبہ کہنے لگیں۔

"بیٹا بیگار میں کیا خرابی ہے! بچاری رعایا کو اپنی نمک حلالی دکھانے کا موقع ملتا ہے ان کا تو کام کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہتا ہے۔"

مینر کے حواس سنبھل چکے تھے۔ کہنے لگا۔

"افسوس سوامی جی نے پہلے ادھر اشارہ نہیں کیا۔ ورنہ میں بیگار کی اپنے یہاں روک تھام کرتا۔ حق تلفی کہیں نہ ہونا چاہیئے۔ کسانوں کو مزدوری بھی ملے اور پانی بھی۔"

"واہ بھیا! تم تو نہ الٹی مانو نہ سیدھی مانو۔ اچھا لے جاؤ پانی۔ مگر میں نہیں جانتی جو دھرم کی رکھشا کے لئے میرے کارندوں سے لڑائی ہو جائے؟"

مینر متحیر ہو کر رانی صاحبہ کا منہ تکنے لگا۔

"نہر کے پانی سے اور دھرم سے ۔ ۔ ۔ ۔"

رانی صاحبہ نے مینر کی بات کاٹی۔

"تم کو ابھی اس بات کی خبر نہیں؟ بتایئے ان کو سوامی جی مہاراج!"

منیجر صاحب. رانی صاحبہ پچاس ہزار روپے کا ایک مندر اور پچاس ہزار روپے کی ایک مسجد بنوا رہی ہیں۔ نیو پڑ چکی ہے۔ سیمنٹ کا آرڈر دیا گیا ہے۔ آپ کو مسجد کا نقشہ دکھاؤں گا۔ واہ کیا کہنا اس کا! رانی صاحبہ کے نزدیک مسجد اور مندر یکساں احترام کی چیزیں ہیں"۔

"مگر نہر کے پانی سے ......؟"

"ارے جب باغوں کے لئے کنوئیں بنوانا پڑیں گے تو پھر مسجد اور مندر کے لئے روپیہ کہاں رہے گا۔ تم تو ٹھہرے نئے زمانے کے۔ مذہب کو کیا جانو۔ مگر میرے کارندے اور رعایا تو اس کے نام پر جان دیتے ہیں"۔

منیجر بالکل سٹ پٹا گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رانی صاحبہ سے کیسے بحث کرے۔ گھبرا گھبرا کر رانی صاحبہ کے چمکتے ہوئے مصنوعی دانتوں کو دیکھ رہا تھا۔ سوامی جی کی طرف دیکھتا تو وہ بالکل بت بنے بیٹھے تھے۔ اور پنڈت جی کو تو صرف رانی صاحبہ کی باتوں پر گردن ہلانا آتا تھا۔

آخر سوامی جی کو منیجر پر ترس آ گیا۔ کہنے لگے۔

"میں بتاؤں رانی صاحبہ۔ آپ ایک قلابہ منیجر بھتیا کو دے دیجئے وہ اپنی کار ہے۔ اس سے ان کا باغ سینچا جائے۔ اور جب خالی ہو تو یہ جس کو چاہیں دیں"۔

"ہاں ہاں ایسا ہو جائے گا۔ اس کا آبیانہ بھی ریاست کے ذمے رہے گا۔" رانی صاحبہ نے ایک لمبا کش کھینچا۔

"میرا باغ! میرا کون باغ؟"

"ارے وہی جو رانی صاحبہ نے آپ کو دیا ہے"۔ سوامی جی بولے۔

منیر کو سوامی جی کی یہ بات بہت بے تکی معلوم ہوئی۔ پھر اک دم سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ بے تکے پن کے جال میں پھنسا جا رہا ہے دام میں نو گرفتار عقاب کی طرح پھڑ پھڑا کر منیر نے کہا۔

"ایسی باتوں سے کیا فائدہ۔ سوامی جی جلسے میں یہ تو طے ہو ہی چکا ہے کہ ہم سارا پانی لیں گے۔"

اب تو رانی صاحبہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"آپ تو بڑے ہٹی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ پانی لیں گے اور میرے کارندوں نے لاٹھی جو چلا دی۔"

"ہم پولیس کو بلا لیں گے۔"

رانی صاحبہ کی تیوریوں پر بل آنا تھا کہ منیر کا نوجوان خون غصے سے کھولنے لگا۔ مگر اس نے بہت ضبط سے کام لیا۔

پولیس کا نام سنتے ہی سوامی جی نے گرک کر کہا۔

"کیسی شرم کی بات ہے منیر صاحب! کسان سبھا کے آدمی ہو کر سرکاری پولیس بلانے کی باتیں کرتے ہو۔ ہم تو مر جائیں تو بھی پولیس کا نام نہ لیں۔"

منیر ذرا کھسیا گیا۔ مگر پھر مضبوطی سے کہنے لگا۔

"پانی تو سوامی جی ہم لوگوں کو لینا ہے۔ پولیس نہ کام دے گی تو میں اخباروں کے نمائندوں کو بلا لوں گا۔ قومی لیڈروں کو بلا لوں گا اور کوئی نہ کام دے گا تو اپنے کالج کے ساتھیوں کو بلا لوں گا۔ مگر پانی ہم لے کر رہیں گے۔"

رانی صاحبہ۔ سوامی جی اور پنڈت جی، سب چپ ہو گئے اور

منیر اس جلسے سے اٹھ کر چلا آیا اور پیدل اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن احتیاطاً اس نے سڑک کو چھوڑ کر پگ ڈنڈی کی راہ اختیار کی۔

رات گئے منیر محل میں واپس آیا۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ انتظار میں نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں بند ہونے کی سکت ہی نہ تھی۔ بوڑھا شوکت انتظار میں جاگ رہا تھا۔ بولا۔ بھیا' جواب ملا' ہاں' داہنی جھنجی سے ایک لمبی آہ نکلی اور اندھیرے میں ڈوب کر شکستہ کنگوروں سے جا ٹکرائی۔ اندھیرے سے ایک ابابیل پھڑپھڑاتی ہوئی نکل آئی۔ منیر کے دل پر افسردگی کا پردہ آ گرا۔ جس پر ماضی خطوں میں مٹی ہوئی شان و شوکت کی دھندلی دھندلی تصویریں تھیں۔ اس پردے کے سامنے محل کھڑا آہیں بھر بھر کر کہہ رہا تھا۔ "تم نے میرے لئے کیا کیا؟ تم نے میرے لئے کیا کیا؟"

(۳)

تین مہینے کے اندر اندر بدلو کی دنیا بدل گئی۔ مردہ بیلوں کی جگہ سینچائی کرنے نہر آ گئی۔ کھیت میں آس کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ مہینوں کا بیمار بیٹا ہنسنے لگا۔ ننھے ننھے پوتی پوتا گڑ دھانی کے شوق میں دن دن بھر دھان کے کھیتوں میں نکوائی کرنے لگے۔ جب پودے اتنے دل سے پالے گئے تو جھوم جھوم خوب بڑھے۔ بدلو کے کھیت کے ساتھ ساتھ سب کسانوں کے کھیت بڑھے۔ ابھی ساون آدھا بھی نہیں گزرا تھا کہ دھانی رنگ کھیتوں پر ایسا چھایا کہ کہیں تل برابر مٹی نظر نہیں آتی تھی۔

بھادوں پار ہوتے ہوتے کھیت سنہرے ہو گئے۔ گابھن بالیوں کو

دیکھ دیکھ کر کسانوں کے دل بڑھ رہے تھے۔ پرجاؤں سے ہنس ہنس کر ڈلیا بھر بھر دھان کے دعوے ہو رہے تھے۔

جب بدلو کے دوارے پر چوٹی دار کھلیان آ کر لگا ہے تو بچوں کی چیخوں اور تالیوں سے کان پڑے آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس شور کے ساز پر یہ چرچا تھا کہ "منیر بھیا یہ دھان دلائن ہیں"۔ گاؤں میں ہر طرف کھلیانوں کے ٹیلے تھے۔ اور ہر طرف یہی چرچے۔ منیر حیران تھا کہ چند گھنٹوں کی محنت کا اتنا بڑا پھل! اس کو جھجک اور شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کسانوں سے کترا کترا یا گھوم رہا تھا۔

اب دیوالی اور عید ساتھ آپڑیں۔ دونوں خوب منائی گئیں۔ راتوں کو چراغاں ہوا۔ دن کو مٹھائیاں اور سوئیاں بٹیں۔ بچوں کے ہاتھوں میں گڑ دھانی، عورتوں کے گلے میں لہریا اوڑھنیاں۔ اور مردوں کے تن پر دودھ جیسے اُجلے اُجلے انگوچھے نظر آنے لگے۔

جب بارش کا اندیشہ نہیں رہا تو کسان سبھا کی ڈسٹرکٹ کانفرنس ہوئی۔ پہلا رزولیشن سوامی جی نے پیش کیا۔ جس میں رانی صاحبہ کا شکریہ ادا کیا۔ کہ انہوں نے اپنے باغوں کا نقصان کر کے گاؤں والوں کو نہر دے دی۔ تائید پنڈت جی نے کی۔ انہوں نے رانی صاحبہ کی دریا دلی اور رعایا پروری کی بہت تعریفیں کیں۔

دوسرا رزولیشن پنڈت جی نے پیش کیا۔ اس میں کسان سبھا کی طرف سے سوامی جی مہاراج کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنی جان توڑ کوششوں سے نہر کا پانی کسانوں کو دلوایا۔ تائید گرو نرائن نے کی جو ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکریٹری تھے۔ تقریر بہت جوشیلی تھی۔ بتایا کہ چھ برس ہوئے جب

محکمہ نہر نے فیصلہ کر دیا تھا کہ نہر کا پانی صرف کھیتوں کے لئے ہے۔ پھر بھی رانی صاحبہ خزانے کا ناگ بنی نہر پر قبضہ جمائے بیٹھی رہیں۔ آخر سوامی جی سے نہیں دیکھا گیا۔ حالانکہ رانی صاحبہ کے کارندوں سے ہر قسم کا اندیشہ تھا۔ حالانکہ رانی صاحبہ سوامی جی کے لڑکے کو جو اسکالرشپ دیتی ہیں اس کے بند ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ پھر بھی اس قربانی کے پتلے سوامی نے رانی صاحبہ سے جھگڑا مول لے ہی لیا۔

جب کانفرنس ختم ہو گئی اور آپس کے دس بارہ لوگ رہ گئے تو سوامی جی ایک دم سے بپھر گئے۔ اور گرو نرائن سے کہنے لگے۔

"کیوں جی! تم بڑے ویسے آدمی ہو۔ میں نے تم کو ڈسٹرکٹ بورڈ میں پہنچایا۔ سکریٹری بنوایا۔ سو ڈیڑھ سو ماہوار کی آمدنی کا سہارا کر دیا۔ اس کا یہ بدلہ کہ آج مجھے بھرے جلسے میں رسوا کیا۔"

گرو نرائن حیرت سے سوامی جی کا منہ تکنے لگا۔

"رسوا کیا؟ میں نے؟ کیسے؟"

"او یہ پوچھتے ہو کیسے؟ یہ اسکالرشپ کی بات کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ — اس وقت ہر شخص سمجھتا ہو گا کہ میں رانی صاحبہ کے ہاتھ بکا ہوا ہوں۔"

مگر یہ تو آپ ہی نے کہا تھا کہ وہ اسکالرشپ دیتی ہیں اس پر بھی میں ان سے جھگڑ گیا۔"

"میں نے کہا تھا؟ کب کہا تھا؟

گرو نرائن نے التجا بھری نظروں سے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ وہ دبی آواز میں کہنے لگے۔

"وہ آپ نے — سوامی جی — جب گرونرائن کو تقریر کے پوائنٹ بتا رہے تھے —"

سوامی جی آگ بگولا ہو کر پنڈت جی پر برس پڑے۔

"میں نے کہا تھا؟ کہا تھا تو یہ کب کہا تھا کہ یوں بھرے جلسے میں کہہ دو؟ — پنڈت جی — کچھ نہیں — اس میں تمہارا بھی ہاتھ ہے — میں جانتا ہوں — تم سے میرا عروج نہیں دیکھا جاتا"

اب تو پنڈت جی کی بھی تیوریاں چڑھ گئیں۔ آنکھیں لال ہو گئیں۔

"سوامی جی — منہ نہ کھلواؤ — میں ذرا تمہارے سوامی پن کا خیال کرتا ہوں — ورنہ تمہاری تو وہ حرکتیں ہیں — ابھی بتانے پر آجاؤں تو —"

سوامی جی بلبلا کر کھڑے ہو گئے۔

پنڈت جی بھی ناگ کی طرح پھن پھنا کر سامنے آگئے۔

منبر یا تو ہکا بکا کھڑا ہوا دور سے یہ میلہ دیکھ رہا تھا یا کود کر بے اختیار بیچ میں آگیا۔ "پنڈت جی — پنڈت جی — میری سنو — میری سنو۔"

منیر نے کسی نہ کسی طرح پنڈت جی کو ٹھنڈا کیا۔ وہ ٹھنڈے ہوئے تو سوامی جی بھی دھیمے پڑے۔

"سوامی جی جانے دیجئے۔ یہ باتیں پھر طے ہو جائیں گی۔" منیر نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی۔

سوامی جی فریادی بن کر منیر سے کہنے لگے۔

"دیکھو بھیا صاحب۔ میں تو پنڈت جی سے کچھ کہہ بھی نہیں رہا تھا

میں تو گرد نرائن کے آگے سر پیٹ رہا تھا کہ تم نے آج مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔"

پنڈت جی دور سے بولے:۔

منیر بھیا! میں نے جو سچ بات کہہ دی کہ تم ہی نے ایسا گرد نرائن سے کہا تھا تو۔۔۔۔۔"

منیر نے پھر پنڈت جی کو خوشامد کر کے خاموش کیا۔ سوامی جی کو کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کو احساس تھا کہ واقعی سوامی جی کی سبکی ہوئی۔

"گرد نرائن نے بے شک بے جا بات کہی۔ ایسا نہ چاہیئے تھا۔"

"منیر بھیا" گرد نرائن نے مظلومی سے کہا۔ "تم مجھ سے گنگا جل اٹھوا لو یہی کہا تھا مجھ سے سوامی جی نے۔"

منیر سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہوگا۔ سوامی جی نے اپنی قربانی جتلانے کے لئے اسکالرشپ والی بات کہہ دی ہو گی۔ گرد نرائن ٹھہرا بھولا آدمی۔ بلا سوچے سمجھے تقریر میں کہہ گزرا۔ مگر اس سے بچارے سوامی جی کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ اور کافی ذلت ہوئی۔ منیر نے گرد نرائن کو تو رخصت کر دیا۔ پھر سوامی جی کو لے کر چلنے کے لئے اُٹھا۔ چلتے چلتے پنڈت جی نے کہا۔

"سوامی جی اب آپ کی باتیں مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتیں۔"

پنڈت جی کا غصہ اور ہی بات پر تھا۔ سوامی جی نے شکریہ جو ادا کرایا۔ اس میں صرف اپنا نام رکھا۔ پنڈت جی کا نہیں۔ ریزولیشن کا محرک بھی پنڈت ہی کو بنایا۔ کہ کہیں دوسرا ہوا تو ممکن ہے پنڈت جی سازش کر کے اپنا نام بڑھوا لیں۔

منیر کو بھی سوامی کی یہ حرکت ناپسند ہوئی تھی۔ اگر شکریہ ادا کرنا

ایسا ہی ضروری تھا تو تینوں کا نام آنا چاہیئے تھا۔ مگر اس وقت تو سوامی جی ایسے مظلوم تھے کہ منیر کو ان پر ترس آ رہا تھا۔

اس کے بعد سے تو ایسا ہونے لگا کہ جب تک منیر نہ ہو سبھا کے یہ تینوں پرزے ساتھ حرکت نہ کر سکتے۔

"اماں!"

"ہاں بیٹا!"

"اسی چھپر کے نیچے خود رہتے ہیں۔ اسی کے نیچے گائے بیل باندھتے ہیں۔ وہ اپنی لاتوں سے کیچڑ گھنگولتے ہیں۔ اس میں گو موت ملاتے ہیں پھر سب سڑتا ہے!"

"پھر کیا کرے غریب کسان؟ اس کو خود بھی زندہ رہنا ہے اور بیلوں کو بھی زندہ رکھنا ہے۔ اور اتنی مقدرت نہیں کہ دو دو چھپر چھائے۔"

"اسی لئے تو آئے دن ان کے بچے مرتے رہتے ہیں!"

"ان کی موت کا ماں باپ کو تو دکھ ہوتا ہی ہے۔ مگر سچ پوچھو تو یہ بھی دین ہے خدا کی۔ سب جی جائیں تو نوالے نوالے کو ترستے پھریں!"

منیر ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا۔

"اماں!"

"ہاں بیٹا!"

"ہمارے محل کی دیواریں کتنی اونچی اونچی ہیں۔ کتنی موٹی ہیں۔ ان کی نیو کیسی گہری ہے؟"

"ہاں ہیں تو!"

"اتنی اینٹوں سے تو گاؤں بھر کے مکان بن سکتے ہیں، پکی سڑک ہو اور اس کے دونوں طرف پکے پکے مکان۔ کیسا بھلا معلوم ہوگا۔ اور ان بچاروں کی زندگی کیسی ......"

"ہاں بیٹا!"

منیر جوش سے کہنے لگا۔ اس کی آنکھیں سچے ہیروں کی طرح جوت دینے لگیں۔

"اماں! ہمارے محل کی ایک ایک اینٹ چلی جائے۔ ہم لوگوں کو جھونپڑے میں رہنا پڑے اور ایسا گاؤں بن جائے تو میں سمجھوں گا کہ سب سوارت ہو گیا۔"

"سچ ہے بیٹا!"

ماں نے بیوگی کا سفید دوپٹہ سر پر آن سے سنبھالا۔

"یہی ہیں کام اچھوں کے۔ یہی شمشیر کے جوہر۔ پچھلے سیلاب میں جب گاؤں کے گاؤں بہہ گئے تھے تب تمہارے ابا کو نہ اپنی جان کی پروا تھی۔ نہ بال بچوں کی اور نہ روپے پیسے کی۔ انہوں نے گاؤں والوں کی جانیں بچانے کے پیچھے ہر چیز کی بازی لگا دی تھی۔"

محل سے ایک دبی ہوئی صدا نکلی جو گلابی بالا خانے کی بیلوں سے ہوتی ہوئی شکستہ کنگوروں سے جا ٹکرائی۔

اس بھولی ہوئی صدا کو سن کر ماں نے بیٹے اور بیٹے نے ماں کی طرف دیکھا۔ پھر دونوں نہ جانے کیوں مرجھا کر کسی کشمکش میں ڈوب گئے۔

(۴)

نہر بہتی رہی کھیتوں کو پانی ملتا رہا. فصلوں پر فصلیں تیار ہوتی رہیں. کھلیانوں کے پونی دانہ ڈھیر لگتے رہے. اسی طرح کئی سال گزر گئے.

دودھ پیتے بچے بڑے ہو گئے. بڑے بچے سیانے ہو گئے. نئی پود نے نہ نہر کو بند دیکھا تھا اور نہ اس کے کھلنے کی قدر جانتے تھے. وہ جانتے تھے تو یہ جانتے تھے کہ نہر ہمیشہ سے بہتی ہے اور کھیتوں کو سیراب کرتی ہے.

نئی پود نے جہاں بہتی ہوئی نہر دیکھی تھی وہاں کسان سبھاؤں کے جلسے بھی دیکھے تھے. احتجاجی جلوس بھی دیکھے تھے. لاٹھی چارج بھی دیکھا تھا. اور بار بار کوششوں سے چھوٹی موٹی کامیابی کی خوشی بھی دیکھی تھی.

پانچ سال پہلے منیر سیاست کی جن موٹی موٹی باتوں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک جاتا تھا. آج لڑکوں اور لڑکیوں کی زبانوں پر رچی ہوئی تھیں.

ایک لڑکے نے ڈنڈے سے کپڑا باندھ لیا ہے. آگے آگے چل رہا ہے، پیچھے پیچھے لڑکوں کی بے ترتیب قطار ہے. انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد، سامراج ناس ہو، کے نعرے لگ رہے ہیں. کبھی کبھی کسی قومی یا کسانی گیت کا کوئی مصرع بھی کوئی لڑکا گا دیتا ہے. منیر اپنے کوٹھے پر سے یہ تماشا دیکھا کرتا اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا.

چاندنی کا کھیت تھا. محل کی دیواریں چاندی کی پہاڑیاں معلوم

ہو رہی تھیں۔ مرغ نور کی بارش سے خوش ہو ہو کر بے وقت بانگ دے رہے تھے۔ منیر چھت پر لیٹا تھا۔ کان "انقلاب زندہ باد" کی صداؤں پر لگے تھے۔ جو دور سے ہوائیں اڑتی ہوئی آ رہی تھیں۔

"اماں۔ دیکھا تم نے! ——— ہماری کھیتی تیار ہو رہی ہے۔"

ماں نے یہ صدائیں سنیں، چہرا مادرانہ غرور سے منور ہو گیا کہ میرے بیٹے کا پیغام کہاں کہاں پہنچ گیا ہے۔

"ہاں بیٹیا۔ بڑا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ ننھے ننھے بچوں کا جلوس۔"

منیر کا چہرہ ضبط کئے ہوئے جوش سے دمک اٹھا۔

"اماں! میری سمجھ میں اب آیا کہ وہ کون سا جذبہ ہوتا ہے جس کے تحت لوگ اپنی جان قومی کاموں پر نچھاور کر دیتے ہیں۔"

"آسمان پر ایک شہاب چھوٹا۔ ہر طرف روشنی ہو گئی۔

منیر کا پیغام دور دور پہنچ چکا تھا۔ شہروں اور دیہاتوں میں گھس گیا تھا۔ مگر خود منیر اپنے گاؤں سے چند میل سے زیادہ نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ اپنے محل سے دور جانے گھبراتا تھا۔ دور کا حلقہ سوامی جی اور پنڈت جی کے حوالے تھا۔ وہ دور دراز دیہاتوں کو نکل جاتے تھے اور پندرہ پندرہ بیس بیس دن کا گشت لگا کر واپس آتے تھے۔

یہ بات نہیں کہ منیر نے ایسے دورے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ ارادہ بھی کیا اور ایک مرتبہ ارادے کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ مگر یہ تجربہ بہت تلخ رہا۔

جب سوامی جی کی بدانتظامیوں کی شکایتیں بہت سننے میں آئیں اور دور کے دیہات والوں کا بہت اصرار ہوا کہ آپ خود چلئے

منیر چھپا۔ تو دس دن کا پروگرام بنا کر محل کو خیرباد کہا۔ منہ اندھیرے نکل کھڑا ہوا اور گاؤں گاؤں گھومتا رہا۔ اندھیرا ہو جانے پر اس جگہ پہنچا جہاں رات گزارنا تھی۔

یہاں چھپر کے نیچے بیس پچیس کسان تاش کی گڈی کی طرح ایک دوسرے سے چپکے بیٹھے تھے۔ بیچ میں ایک عدد چندھی لالٹین جل رہی تھی۔ اس کی کرنوں سے کسی کی ناک روشن تھی تو کسی کے ہونٹ، کسی کا ماتھا تو کسی کے دانت۔ کسی کی صرف انگلیاں اندھیرے سے نکل کر روشنی میں نکھر گئی نظر آتی تھیں۔

منیر ان کسانوں میں جا بیٹھا اور باتیں کرنے لگا۔ ان بچاروں کو ذرا نہیں امید تھی کہ نازوں کا پالا، محل کا رہنے والا منیر آئے گا اور جھونپڑوں میں رات گزارے گا۔ ان کی آوازیں شکریئے کے ساتھ بوجھ سے اتنی دبی ہوتی تھیں کہ بات کرنے میں لڑکھڑا جاتی تھیں۔

بارہ بجے کے قریب، کھانا آیا۔ دس بارہ قسم کی ترکاریاں اور دالیں تھیں۔ مقدار اتنی تھی کہ منیر کے ایسے چھ کھا لیں۔ لیکن مزا ایسا کہ جو چیز چکھتا جی برا ہو جاتا۔ کسی میں کچا ہند۔ کسی میں ہینگ، کسی میں بھبھک۔ کسی میں سیٹھا پن — منیر نے اس محبت کا خیال کیا جس سے یہ لوگ کھانا للئے تھے۔ اور اپنا پیٹ بھر لیا۔

کھانے کے بعد میزبانوں نے منیر کو ایک کمرے میں لٹا دیا۔ اور دروازے بھیڑ کر چلے گئے۔

منیر سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ آج نہ سر پر باپ دادا کی چھت تھی اور نہ ماں مامتا بھری انگلیاں بالوں میں۔ اوپر بڑھے میرٹھے

جھانکڑوں سے پٹی چھت تھی جس پر مٹی کے تیل کی کپی کی روشنی میں بڑے بڑے سائے نظر آرہے تھے۔ پلنگ ایسا جھولا تھا کہ منیر نیچے دھنسا جا رہا تھا۔ گوبر کی بو، بھوسے کی بھکراہند سے ملی ہوئی ہر طرف سے گھسی آ رہی تھی۔ منیر نے رضائی سے ناک بند کرنا چاہی ——— اُفوہ ——— رضائی کے کنارے میل اور تیل سے موم جامہ ہو رہے تھے۔ گھن سے منیر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

کسی وقت اکبارگی آنکھ کھل گئی۔ چراغ اپنی آخری جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ اس کی لَو زور سے تاریکی میں غوطہ مارتی اور غائب سی ہو جاتی۔ جب روشنی کی آس ٹوٹ جاتی تب اُبھر آتی۔ لَو کے ہر غوطے کے ساتھ دیواریں کئی قدم آگے بڑھ آتی تھیں اور چھت نیچے جھک پڑتی تھی۔ امید و بیم کی یہ زندگی ذرا ہی دیر رہی۔ پھر جو لَو نے غوطہ مارا تو نہ اُبھری۔

منیر سوچنے لگا کہ میں کہاں ہوں؟ کس بچھینی میں ہوں؟ میرا سر کدھر ہے اور پاؤں کدھر؟ اک دم پتہ چلا کہ سارا جسم سوئیوں پر ہے ——— اُفوہ ——— کھٹمل ——— منیر گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ یاد آ گیا کہ میں دورے پر ہوں۔ اور اپنے پیارے محل سے بہت دور ——— اچھا ——— تو کمرے کا دروازہ کدھر ہے؟

بہت دیر کے بعد یادداشت نے کام دیا۔ منیر ٹٹولتا ہوا دروازہ پر آیا۔ اس کو کھولا۔ باہر چاندنی پھیلی تھی۔ مگر پھیکی۔ کیونکہ اس میں کہرا ملا ہوا تھا۔ آدھے سے زیادہ درخت۔ کھیت اور مکان سب غبار معلوم ہو رہے تھے۔ غبار تھا کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور اُفق

سے افق تک پھیلا ہوا تھا۔ منیر کا دل ڈوبنے لگا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں غبار کی آندھی میں کتاب کے ایک ورق کی طرح اڑا جا رہا ہوں۔ نجانے کدھر سے۔ نہ جانے کدھر کو ___ بالکل بے یار و مددگار۔

منیر نے دس دن جوں توں پرانی چھتوں کے نیچے کاٹے۔ جیسے جیسے دن بیتتے گئے۔ باپ دادا کی بلند و بالا چھت اور اماں کی سکون بخش انگلیوں اور گلابی بالاخانے کے پُرکیف نظاروں کی یادیں دل میں چٹکیاں لیتی گئیں۔ حالات کا عادی ہونے کے بجائے ان سے اور بیزار ہوتا گیا۔ کسانوں کی شکر گزار نگاہوں اور جوشیلے نعروں سے جو سکون ملتا تھا وہ بھی گھٹتا گیا۔ جب دسویں دن واپس آ رہا تھا تو سارنگی کے ڈھیلے تاروں کی طرح تمام جذبات بے آواز تھے۔ اگر کوئی خواہش تھی تو صرف یہ کہ کسی طرح اپنی ماں اور محل کی پیار بھری گود میں پہنچ جاؤں۔

اس کے بعد منیر نے پھر کبھی سوامی جی کی طرح بنجارے بن کر کام کرنے کی ہمت نہ کی۔

(۵)

پانچ برس میں رانی صاحبہ کے باغوں کے پودے، پودوں سے درخت بن گئے۔ اور پھل دینے لگے۔ باغوں کی دیکھ بھال اور پھلوں کی خرید و فروخت کے لئے باغوں کے بیچ میں رانی صاحبہ کے کارندوں کے چھوٹے چھوٹے بہت سے پکے مکانات بن گئے۔ ایک خوبصورت سا گاؤں آباد ہو گیا۔ اس گاؤں میں لکھا پڑھی کرنے والے کارندے کم تھے اور لٹھ باز سپاہی زیادہ۔

شروع شروع میں تو لٹھ باز سپاہیوں نے آس پاس کے گاؤں

والوں سے خوب بیگار لیا۔ لیکن جیسے جیسے کسان سبھا کا زور بڑھتا گیا ان کی طاقت گھٹتی گئی۔ ہوتے ہوتے یہ نوبت پہنچ گئی کہ روپیہ کی جگہ وہ سوا روپیہ دینے کو کہتے۔ ڈانٹ پھٹکار کی جگہ خوشامد درامد سے کام لیتے۔ پھر بھی مزدور نہ ملتے۔ کیونکہ کسانوں کو ان کی بات پر اعتبار نہ تھا۔ خبر یہ گرم تھی کہ انہوں نے دو کسانوں کو مار ڈالا ہے۔ اور وہیں کہیں دفن کر دیا ہے۔

ایک دن کسان سبھا کے سامنے باغوں کے منیجر کی درخواست پیش ہوئی۔ کہ ہم کو ڈھائی سو مزدوروں کی ضرورت ہے۔ ہر قسم کی مناسب شرطیں اور مزدوری ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اب اس عروج کو پہنچ چکی تھی کسان سبھا۔

کسان سبھا کا پیغام گاؤں گاؤں پہنچ چکا تھا۔ دور دراز علاقوں میں کانفرنسیں ہوئیں جن میں پندرہ پندرہ بیس بیس ہزار کسان اکٹھا ہوتے۔ مرکزی کانفرنس میں بیس بیس کوس سے کسان ستو اور چبینے پر گذارہ کرتے ہوئے پیدل چل کر آتے۔ اسی طرح ستو اور چبینے پر دو روز ٹھہرتے اور پھر اسی طرح واپس چلے جاتے۔ اس کانفرنس میں لاکھ سوا لاکھ آدمیوں کی گنجائش کا پنڈال بنتا اور سب بھر جاتا۔

اب کی کانفرنس کی صدارت ملک کے سب سے بڑے لیڈر نے منظور کی تھی۔ اس لئے بہت شاندار پنڈال بنایا گیا۔ مہمانوں کے ٹھہرنے کے لئے خیمے نصب کئے گئے۔ شہر کے رئیسوں نے کانفرنس کے کاموں کے لئے اپنی کاریں دے دیں۔ جلسے میں بڑے بڑے اخباروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کی تصویریں اخباروں میں چھپ کر

ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں۔ ایک ڈسٹرکٹ کسان سبھا کی پوزیشن اک دم سے آل انڈیا ہو گئی۔

کانفرنس ختم ہو جانے کے بعد منیر آدھی رات کو محل کو واپس ہوا ہاتھ میں مہمانوں اور میزبانوں کے گروپ کا فوٹو تھا۔ اس میں منیر بہت سے ہار پہنے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر کے برابر بیٹھا تھا۔

کسان سبھا کے عروج کے ساتھ ساتھ محل کا زوال ہو رہا تھا۔ پھاٹک کی دیواریں پھٹ پھٹ گئی تھیں۔ شگافوں سے کانٹے دار جھاڑیوں نے سر نکالا تھا۔ اور خوب خوب بڑھی اور پھیلی تھیں۔ وقت بے وقت اوپر سے کانٹے برساتی رہتی تھیں۔ اب ہر آنے جانے والے کو دیکھ بھال کر پاؤں رکھنا پڑتا تھا۔ ان کمزوریوں سے دیواریں زمین کی طرف جھک آئی تھیں۔ ان کے شگافوں سے ملبہ اور لونا رستا رہتا تھا اور رِس رِس کر نیچے ڈھیر ہوتا جاتا تھا۔ برجیوں میں سے ایک کو تو آندھی اور بارش نے ایسا مٹایا تھا کہ نام و نشان تک نہ چھوڑا تھا۔ دوسری پر پرانی شوکت کا نام لیوا جو ایک کھمبا رہ گیا تھا اس کی بھی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ اب تو وہ آسمان کی طرف سیدھی طرح اشارہ بھی نہ کر سکتا تھا۔

اس وقت رات نے محل کی سرا بتری کو نا بوتی غلاف پہنا دیا تھا۔ رونق بھرے جلسے اور زندگی کی چہل پہل سے بسے ہوئے پنڈال سے نکل کر یہاں پاؤں رکھتے ہوئے ہاتھوں پیروں میں تشنج سا محسوس ہوتا تھا۔

منیر ڈیوڑھی کی تاریکی میں گھسا۔ اس کی چاپ اوپر کسی جگہ اندھیرے

میں گونج تھی۔ اس وقت محل سے وہی پرانی آہ نکلی اور شکستہ کنگوروں سے ٹکراتی ہوئی کہیں گم ہو گئی۔ محل کی ایک ایک چیز آہ بھر رہی تھی۔ اور منیر سے کہہ رہی تھی۔

"تم نے میرے لئے کیا کیا؟ تم نے میرے لئے کیا کیا؟"

گلابی بالاخانے کے در منیر کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جن کا سہاگ بھرا کاجل طویل فراق کے آنسوؤں نے دھو دیا ہو۔

"اماں"۔

"ہاں بیٹا"۔

منیر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ ماں ہاتھ میں خوشبودار تیل کا کنٹر لئے بیٹھی تھی۔

"اماں"۔

"ہاں بیٹا"۔

"اماں"۔

"ہاں بیٹا"۔

منیر ذرا جھجکا۔ ٹھٹکا۔ پھر ماں کی طرف تصویر بڑھا کر کہنے لگا۔

"اماں! یہ تصویر دیکھو۔ میں کہتا ہوں۔ کیا اس سے ہمارے محل کی زینت نہیں ہوتی؟ بس ہاتھی ہی سے ہو سکتی ہے؟"

منیر پھر ٹہلنے لگا۔

ماں بیٹے کی اندرونی کشمکش بھانپ گئی۔ کہنے لگی۔

"زینت ہوئی کیوں نہیں ہے بیٹا۔ سو زینتوں کی ایک زینت۔"

ایک خوشگوار جھونکا کہیں سے آکر منیر کے بدن کو سہلا گیا۔ اس کے ٹہلنے کی رفتار میں سستی آگئی۔

"میں کہتی ہوں منیر! محمد علی اور اجمل خاں کی آج جو عزت ہے راجوں مہاراجوں کی نہ ہوگی۔"

محمد علی اور اجمل خاں کو مرے ہوئے مدت ہو چکی تھی۔ ان کی ہڈیاں تک قبر میں گل گئی ہوں گی۔ لیکن منیر کی ماں کے لئے وہ زندہ تھے۔

"میں تو پانچوں وقت دعا مانگتی ہوں کہ خدا میرا ایسا سپوت ہر ماں کو دے۔"

منیر آہستگی سے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

ماں: "کیوں بیٹا! یہ تصویر اسی وقت نہ لگا دیں؟ ایسی جگہ لگائیں جہاں ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے رہے۔"

ماں بیٹے نے مل کر وہ تصویر شہ نشین پر اس جگہ لگا دی جو ہولین کی تصویر کے لئے خالی تھی۔ اور گلابی بالاخانے کے بالکل سامنے تھی۔ گرد اور جالے سے اٹی ہوئی دیوار پر تصویر جو لگی تو سہاگ کی سی رونق آگئی۔ اب تو ہر چیز سے اونچی یہ تصویر تھی۔ اور تصویر میں منیر گلے میں ہار پہنے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر کے پہلو بہ پہلو بیٹھا تھا۔

ماں نے منیر کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا "خدا نے جس طرح گلے میں ہار ڈالا ہے اسی طرح ماتھے سے سہرا بھی باندھے۔"

شہ نشین پر تصویر کا لگنا تھا کہ محل کی قسمت چمک گئی۔ یا تو محل سے فرنیچر اور تمام چیزیں نکل نکل کر گسان سبھا جایا کرتی تھیں۔ یا کسان سبھا کا

پورا او فتراپنے کچے گھر کو چھوڑ کر محل کے ایک کمرے کی زینت بن گیا۔سوامی جی اور پنڈت جی اور گرو نرائن اور سبھا کے سب کارکن یہیں اکٹھا ہونے لگے۔ اور محل ہی کی چھت کے سایئے تلے ان کے انقلابی فیصلے ہونے لگے۔ شہر اور دیہاتوں کے بڑے بڑے لوگ جو سبھا والوں سے ملنے آتے محل ہی میں آتے اور اس کے پھاٹک کے سامنے ان کے موٹر اور ہاتھی کھڑے ہوتے۔

آخر ایک دن وہ بھی آگیا جب قدیم خیال کے دادا میاں تک نے محل کا نیا عروج تسلیم کر لیا۔ وہ دن وہ تھا جب رانی صاحبہ ریاست کے بڑے بڑے موٹروں پر مصاحبوں اور کارندوں کے جھرمٹ میں دادا میاں کی دعایئں لینے آگئیں۔ اس کا منشا منیر کو راضی کرنا تھا۔ اس دن سے دادا میاں کی آہیں بند ہو گئیں۔ اور ان کے شوکت میں تو کچھ جوانی کے ایسے آثار نظر آنے لگے۔

اب جو منیر نظر ڈالتا ہے تو دنیا ہی دوسری نظر آتی ہے۔ صرف شہ نشین کی تصویر اور آنے والوں کے موٹر اور ہاتھی ہی محل کی زینت نہ تھے۔ زینت کی وسعتیں بہت زیادہ تھیں۔ دور دراز کے دیہاتوں کی کانفرنسیں۔ سڑکوں سڑکوں گھومنے والے جلوس۔ گلیوں، گلیوں گونجتے نعرے یہ سب کیا تھے۔ کیا ان میں منیر کا ہاتھ نہ تھا؟ اگر اس کا ہاتھ تھا تو کیا اس ہاتھ میں محل کی روایات کا زور نہ تھا؟ پھر یہ سب عروج کس کا عروج ٹھہرا!

منیر اپنے دل میں محل کے گنگوروں کی تعمیر نو کانفرسوں سے کر لیتا تھا۔ لیکن گلابی بالاخانے کے سنسان پن میں ان چیزوں سے کوئی کمی نہ آتی تھی۔ یہ ہزاروں کا مجمع۔ یہ انقلاب زندہ باد کے نعرے

اور جیسے کا رے ۔ یہ سب وہاں پہنچ کر سنلٹے اور خاموشی میں تبدیل ہو جاتے تھے ۔ وہ تو اگر آباد ہو سکتا تھا تو بس عطرِ سہاگ ۔ سہلنے جوڑے سے اور چوڑیوں کی کھنک سے ۔

منبر کی نگاہ بھی بدل چکی تھی ۔ اور کام کا جذبہ بھی ۔ مگر اس کے جوش اور عمل میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔ ہنڈولے کے جس جھولے پر بھی کھینگی دو سب جھولے حرکت کرتے ہیں ۔ اور سارا ہنڈولا چلتا ہے ۔ اسی طرح انسان کے جس جذبے پر بھی ٹھیس لگے ۔ اس کے دل و دماغ کی ساری مشین چلتی ہے ۔

(۶)

کسان کی زندگی بھی مکڑی کا جالا ہے ۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور اس کا تانا بانا ٹوٹا چھوٹی موٹی قرقی ۔ ایک فصل کی خرابی ۔ محنت کرنے والوں میں سے کسی کی سزایابی ۔ ایک کھاتے پیتے کسان گھرانے کو بگاڑ دیتی ہے ۔ اور بگاڑنا بھی ایسا ویسا نہیں ۔ ایسا جس سے بنیتے بنیتے دس برس لگ جائیں ۔ ایسے ایسے مکڑی کے جالوں سے بنتی ہے کسان سبھا ۔ پھر بھلا اس کا عروج کس شمار میں ۔

منبر کی کسان سبھا نے زمینداروں سے ایک سخت مقابلہ کیا زمینداروں کے سپاہیوں نے ان کے سر توڑے اور کھلیان جلائے پولیس نے الٹا کسانوں کا چالان کیا ۔ عدالت نے ان ہی کو جرمانوں اور جیل خانے کی سزا دی ۔ سب جالے ٹوٹ گئے ۔ دل چھوٹ گئے آس بجھ گئی ۔ کسان سبھا چار دن کی چاندنی نکلی ۔ آئی گئی ۔ پھر اندھیرا پاکھ تھا ۔

کسان جب ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھے قیمتی مالا تھے ۔ بکھرے تو ہر ایک کچا دھاگا تھا۔ زبردست جسے چاہے موڑ دے، جب چاہے توڑ دے۔ ہر ایک زمیندار سے خوف زدہ تھا منیجر کی صورت دیکھتا تو جھک جھک کر سلام کرتا۔ مگر سبھا کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتا۔

"مجبور جو کہیں سو منظور۔ مگر اکیلا سبھا میں جاؤں گا تو مٹ جاؤں گا"۔

جب ہر ایک یہی کہتا تو جلسے کی کارروائی بلا حاضرین کے ہوتی تھی۔ مگر ایسی کاغذی کارروائی تو وہ برات ہوتی ہے جس میں نہ دولہا ہوتا ہے۔ نہ براتی۔ ایسی گاڑی کتنے دنوں چل سکتی تھی بھلا، کچھ دنوں کے بعد جلسے بند ہو گئے۔ رجسٹروں۔ بہی کھاتوں اور کارروائی کے دفتروں پر گرد کی تہہ پر تہہ جمنے لگی تھی۔ ہوتے ہوتے یہ گرد اتنی ہو گئی کہ انگلی رکھو تو نشان چھپ جائے۔

گروندراس تو ڈسٹرکٹ بورڈ میں تھے ہی۔ وہیں کے ہو رہے۔ سوامی جی نے رانی صاحبہ کے یہاں آمد و رفت بڑھا لی۔ پنڈت جی نے ہندی پرچار کا کام سنبھال لیا۔ صرف منیر رہ گیا جو محل کے اندر رہتا تو بیکار۔ باہر آتا تو بیکار۔

کسان سبھا کے دفتر میں تالا پڑ گیا۔ پڑے پڑے اس کے کھٹکے میں زنگ آ گیا۔ کنجی بھی کہیں ادھر ادھر ہو گئی۔

منیر اور اس کے ساتھیوں نے کسانوں کے دل میں ایک بیج بو دیا تھا کہ تم ملک کی دولت کے خالق ہو۔ تم کل کے بادشاہ ہو مل کر ایک ہو جاؤ۔ تو دنیا تمہاری ہے۔ کیا بیج تک اس پت جھڑ میں مرجھا گیا؟

کسی کسی وقت منیر کا دل اک دم سے کسان کا دل بن جاتا۔ وہاں وہ

کیا دیکھتا کہ بوئی ہوئی کھیتی ابھی تک ہری ہے۔ تمنا ئیں لہلہا رہی ہیں۔
مستقبل پر ایمان اب بھی ویسا ہی ہے۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ ہاں ایک
چیز کی کمی ہے۔ اس جذبے کی کمی جو کہتا ہے کہ کیسا اپنا نقصان اور کیسا اپنا
فائدہ۔ چلو۔ آگے بڑھو۔ تھا کبھی یہ جذبہ۔ مگر جتنی اس میں سکت تھی اس
سے زیادہ نقصان کا بوجھ جو پڑا تو دب کر مر گیا۔

کیا بالکل مر گیا۔ ایسا کہ اب کبھی نہ اٹھے۔

نہیں وہ اٹھے گا۔ پھر اٹھے گا۔ ضرور اٹھے گا۔ دل کہتا ہے کہ اٹھے گا۔

ہاں کب؟ کوششوں سے کہ خود بخود؟ یہ نہیں معلوم۔

منیر کبھی کبھی اپنے سے کہتا۔ دیکھو یہ ایسی کھیتی نہیں ہے جس کو
لو جھلسا دے یا پالا سکھلا دے۔ یہ نیو ہے مستقبل کی۔ اس پر عمارت بنے گی
عوام کی ترقی کی دیواریں اٹھیں گی۔ برجیاں بنیں گی۔ کنگورے تعمیر ہوں گے
عمارت بنتی چلی جائے گی۔ چلی جائے گی آسمان تک۔ رہتی دنیا تک۔

کیا یہ مسرت کافی نہیں ہے منیر کہ ہم بھی ایک معمار ہیں۔ اس اپنی
عمارت کے؟

مگر اس وقت محل کی آہ اٹھتی اور کہتی۔

"ہم اپنے گھر سے تاروں کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے
پاس اتنے جواہرات ہیں۔

مگر۔ مگر حقیقت کیا ہے؟

وہ تصویر جس میں منیر ہار پہنے ہندوستان کے سب سے بڑے
لیڈر کے برابر بیٹھا تھا۔ اب بھی نگاہوں تلے رہتی تھی۔ مگر اس پر خاک جم

چکی تھی۔ اور مکڑیوں نے جالا تان دیا تھا۔ اب وہ تصویر محل کی زینت نہیں اس کی ابتری میں اضافہ تھی۔

محل کا چند روزہ عروج تپتے اساڑھ کا پہلا چھینٹا تھا جو پیاس بجھانا کیسا جو گنی کر گیا۔ اور پھر حباب کی طرح ناپید ہو گیا۔ وہ زرق برق کپڑوں والے مہمان۔ وہ شاندار موٹر۔ وہ پربت کے ایسے ہاتھی۔ سب صبح کے سہانے سپنے کی طرح آئے گئے ہو گئے۔ پھر وہی کنج قفس۔ پھر وہی صیاد کا گھر۔

ان زوال کے دنوں میں محل کی کوئی دیوار ایسی نہ ہو گی جو جگہ جگہ سے شق نہ ہو چکی ہو۔ کوئی چھت ایسی نہ ہو گی جس کی کڑیاں نہ بول گئی ہوں۔ گلابی بالاخانے میں اس کنواری لڑکی کی افسردہ حسرتیں دم توڑ تی تھیں جو شوہر کی آغوش میں آنے سے پہلے بیوہ ہو گئی ہو۔ گھر والوں کے جیتے جی چمگادڑوں نے اس کو ویرانہ سمجھ رکھا تھا۔ کوئی بلندی ان سیاہ داغوں سے خالی نہ تھی جو دن بھر بھیانک آوازوں سے چیختے تھے۔ اور سر نیچے ٹانگیں اوپر کئے جھولتے تھے۔ فرش ان کی بیٹ سے پٹا رہتا تھا۔ اور فضا گھناؤنی بو سے۔

ویرانی میں بسنے والے پرندوں نے آ آکر یہاں گھونسلے بنا رکھے تھے جلتی ہوئی آنکھوں والی گھاگھس راتوں کو پکار پکار کر کہتی تھی:۔

"ٹیں ٹیں ٹیں۔ ٹیں ٹیں ٹیں ــــ لٹا ــــ دو ــــ لٹا ــــ دو۔ لٹا ــــ دو ــــ"

"اینٹ اینٹ اینٹ اینٹ ــــ لٹا ــــ دو ــــ لٹا ــ دو لٹا دو ــــ"

داو امیاں کے تحت کے پائے گھن چاٹ گئے تھے۔ اب محض مٹی کے اڈانوں پر تھما تھا۔

مہینوں پر مہینے بیتتے گئے۔ سال پر سال چڑھتے گئے۔ مایوسیوں پر مایوسیاں چھاتی گئیں۔ ماں کی ڈھارس بندھانے والی آواز سست پڑتی گئی۔ ہوتے ہوتے بند ہو گئی۔ امید کی رہی سہی کرن ڈوب گئی۔

اب بھی راتوں کو ناں منیر کے تھکے ماندے دماغ کو راحت دینے آتی تھی۔ ماں کی انگلیاں اس کے دکھ بھرے خیالوں کو تھپ تھپاتی تھیں۔ مگر بات چیت نہ ہوتی تھی۔ منیر کہے تو کیا کہے؟ وہ جواب دے تو کیا جواب دے؟ زمانہ گزرتا گیا۔ مایوسی بڑھتی گئی۔ ماں بیٹے کے بیچ میں خاموشی کے پردے گرتے گئے۔

منیر نے تمناؤں کے کتنے دیئے گلابی بالاخانے پر جلائے تھے اور ارمانوں کے کتنے بخور وہاں سلگائے تھے۔ اب اپنی سیلک زندگی کے بعد تو وہ اسی کی زلفیں سنوارنے میں راتوں کو بتا دیتا تھا۔ اس کی حسرتیں بالا خانے کے ستونوں سے چمٹتیں۔ محرابوں کی بلائیں لیتیں اور چلمنوں کو بوسے دیتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اوپر کی بھیڑ بھاڑ کے خلفشار نے اندر کی چہل پہل اتنی بڑھا دی تھی کہ منیر کو اپنے اندر سے باہر آنے کی فرصت ہی کم ملتی تھی۔

اب بھی کبھی کبھار تو وہیں آ کر منیر کسان سبھا پر محل قربان کرنے کی باتیں کرتا تھا۔ عوام پر اپنی جان نچھاور کرنے کے خواب دیکھتا تھا۔ مگر ماں کے لبوں پر خاموشی رہتی۔ وہ خاموشی جو صدیوں سے بند نہ خانے میں ہوتی ہے۔ وہ کہتی تھی کہ کیا ایسی قربانی کرو گے جس پر نہ محل کا عروج

ہوا اور نہ گلابی بالاخانے کی رونق ۔ منیر کی نوزائیدہ امنگ دم بھر میں گھٹ کر ختم ہو جاتی۔ کبھی کبھی ماں بھی محمد علی کے عروج اور محل کی قدیم شان و شوکت کی کوئی بات کہہ اٹھتی۔ منیر بلبلا جاتا۔ جیسے اس کے کہیں زخم ہے اور ماں ناخنوں سے اس کی کرن ادھیڑ رہی ہے۔ اب ماں بیٹے ایک دل نہیں تھے دو انسان تھے۔ الگ الگ دماغوں سے سوچتے تھے۔ الگ الگ راہوں پر چلتے تھے۔

(۷)

دباؤ پڑنے پر چیونٹی تک کاٹتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ زمیندار دبائیں اور کسانوں میں بیداری نہ پیدا ہو، وہ پھر بیدار ہونے لگے اور کسان سبھا کے جھنڈے تلے آہستہ آہستہ اکٹھا ہونے لگے۔ ایک کسان اس گاؤں سے آیا۔ تو دو اس گاؤں سے۔ چار اس گاؤں سے آئے تو تین اس گاؤں سے۔ کسان سبھا کے دفتر کا تالا کھل گیا۔ رجسٹروں کو جھاڑ جھاڑ کر دھوپ دکھائی گئی۔ سوامی جی۔ پنڈت جی گرونرائن اور منیر پھر یکجا ہونے لگے۔ آپس کے جھگڑوں کو بھول کر ریزولیشن پاس کرنے لگے اور اخباروں میں چھپوانے لگے۔ پھر شاندار پنڈال اور کانفرنسوں کی لینڈیں ہرانے لگیں۔

مگر اب کی کسانوں نے توقع کا ساتھ نہیں دیا۔ وہ آرہے تھے۔ اکٹھا ہو رہے تھے۔ مگر بہت آہستہ آہستہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے۔ پہلے کسان سبھا ایسی پھیلی تھی جیسے کریلے کی بیل۔ مگر نئی کسان سبھا ایسے بڑھ رہی تھی جیسے کھجور کا پودا جس میں سال بھر میں ایک پتہ نکلتا ہے۔ جس کا بیج دادا لگائیں تو پھل پوتے کھائیں۔

میں اس ترقی سے مطمئن تھا؟ نہیں مطمئن ہوتا تو کیسے ہوتا! اس کی کنپٹیوں پر سفید بال جھلک آئے تھے۔ گلابی بالاخانہ پازیب کی جھنکار کے لئے بدستور ترس رہا تھا۔ شوکت کی آنکھیں ڈھل گئی تھیں۔ دادامیاں کے پاؤں پر فالج گر گیا تھا۔ اور چاند ڈوبنے سے سورج ڈوبنے تک اُن کے منہ سے آہیں نکلتی رہتی تھیں۔

محل کے پھاٹک سڑگل کر اور جُھک گئے تھے۔ ابھی چند سال اُدھر تک ان کے بیچ سے گھوڑے سوار جاسکتا تھا مگر اب تو بس چار کاندھوں پہ چارپائی نکل سکتی تھی۔

پڑتے پڑتے کہیں تین سال میں جا کر کسان سبھا میں کچھ جان پڑی ہی تھی کہ اس کی زندگی اور موت کا سوال پیش آگیا۔ حکومت نے ایک نیا چندہ لگایا۔ جس کو کسان ادا نہ کر سکے۔ حکومت نے سبق دینے کے لئے دو کسانوں کے کھلیان ضبط کر لئے اور ان پر پہرہ بٹھا دیا۔

اس چندے کے معاملے میں کسان سبھا ابھی تک خاموش تھی۔ کیونکہ اس میں دخل دینے کی طاقت نہ تھی لیکن جب درجنوں مظلوم کسانوں نے آکر اپیل کی تو سوال اٹھا کہ کیا کیا جائے۔ اگر سبھا آڑے وقت میں کسانوں کے کام نہ آئی تو پھر نہ کسی کو سبھا سے امید رہے گی اور نہ کوئی شخص اس کے جھنڈے کے نیچے قربانی کے لئے آمادہ ہوگا۔ اور اگر اس معاملے میں دخل دیتی ہے تو اس کے پاس جو تھوڑے بہت والنٹیر ہیں وہ بھی لاٹھی چارج اور جیل کے حوالے ہو جائیں گے۔

سوامی جی اور پنڈت جی یوں چاہے جیسے بھی ہوں مگر نازک موقع پر اکثر بہادری دکھا جاتے تھے۔ اس موقع پر ان دونوں نے طے کیا کہ ہم لیڈر لوگ تھوڑے سے والنٹیروں کو لے کر جائیں اور لاٹھی چارج اور جیل بھگت لیں۔ اگر حکومت پر اس کا کچھ اثر پڑ گیا تو کیا کہنا۔ نہیں پڑا ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو ہی جائیں گے

یہ تجویز مینر کی تھی اور وہ اس میں پیش پیش بھی تھا۔ اور اپنے محل کو جس حالت میں وہ تھا اسی میں چھوڑ کر جیل بسانے پر آمادہ تھا۔ لیکن اس کے دل میں ایک امید اور تھی۔ وہ یہ کہ اس وقت جو صاحب ضلع کے حاکم تھے اُن کے والد نے مینر کے خاندانی مقدمہ کی پیروی کی تھی۔ اس طرح دونوں خاندانوں میں بڑے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ مینر اور موجودہ حاکم قریب قریب ہم سن تھے۔ اور ساتھ کے کھیلے تھے۔ مینر نے جب کسان سبھا کا کام شروع کیا ہے اسی زمانے میں وہ ڈپٹی کلکٹر ہوئے تھے۔ ان کے والد بیرسٹر صاحب اس وقت زندہ تھے۔ اور انہوں نے مینر کو سمجھایا تھا کہ ان باتوں کو چھوڑ دو۔ آؤ تم کو بھی ڈپٹی کلکٹری دلا دیں۔

جب ایسے خاندانی تعلقات تھے تو مینر کو یقین تھا کہ جب حاکم ضلع کو خبر ملے گی کہ اس تحریک میں میں بھی شریک ہوں تو وہ مجھ سے ضرور بات چیت کریں گے۔ پھر سمجھوتے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

اسی دن سوامی جی، پنڈت جی اور مینر نے والنٹیروں کی ایک چھوٹی سی جماعت لے کر کھلیان پر دھرنا دے دیا۔ چوکیدار نے صدر خبر بھجوا دی۔

مینر کی امید جلد ہی پوری ہوتی نظر آئی کیونکہ خبر ملی کہ جندے کا

معاملہ کسی وجہ سے اتنا اہم ہے کہ ضلع کا حاکم موقع پر خود آنے والا ہے۔

دوسرے دن یہ تینوں لیڈر اپنی حقیر سی جماعت سمیت جسے رات کو ٹھیک سے کھانا بھی نہیں ملا تھا۔ دھرنا دیئے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر نیند اور تکان سے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بال اور چہرے گرد اور بھوسے سے جو کھلیان سے اُڑ اُڑ کر آ رہا تھا۔ اٹے ہوئے تھے۔ اس وقت ضلع کے حاکم کی کار پولیس کی لاری سمیت آ کر سامنے دور پر ایک باغ کے سائے میں رُکی۔ کار کا پٹ کھلا۔ ضلع کا حاکم بھاری بھرکم جسم پر بھاری بھرکم سوٹ پہنے کار سے نکلا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کپتان پولیس سے بات چیت کرنے لگا۔

منیر نے سامنے کے شاندار جھرمٹ کو دیکھا۔ پھر ایک نگاہ اپنے اوپر اور اپنے حقیر مجمع پر ڈالی۔ کیا ہیں زمانے کے کھیل۔ وہ ضلع کا حاکم ہے شاندار کار کا مالک ہے۔ میں یہاں کھڑا ہوں۔ دو پھول ساتھ پھولے قسمت جدا جدا ہے۔ منیر کے سینے میں عجیب کھلبلی مچ گئی۔ ایک زلزلہ آیا گاؤں کے پختہ مکانوں کے نقشے اور کسانوں کی حکومت کے خواب وغیرہ اور جو کچھ بھی وہاں تھا تاش کے گھروندوں کی طرح بھر بھرا کر بیٹھ گئے۔ ان کے نیچے سے مدتوں کی سوئی ہوئی بھاگوان ہتھنی جنگھاڑتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور دفعتاً لوٹ پوٹ کر ایک حسین جمیل کار بن گئی۔ جس نے گلابی بالا خانے کو سرِ محفل کی طرح منہ پر ڈھانک لیا۔ اس کی آڑ سے ایک ہی منظر میں منیر کے من کو ہر لیا۔

ضلع کا حاکم تو دور ہی رہا۔ دو درجن سپاہی لاٹھیاں لیے کر والنٹیروں کی طرف آئے۔ ایک پیادے نے ڈپٹ کر منیر سے کہا۔ "ہٹ یہاں سے!"

منیر میں اس وقت دھرنا دینے والے لیڈر کی خاکساری نہیں بلکہ شاندار کار والے حاکم ضلع کی تمکنت تھی۔ اس نے پیادے کو ڈانٹا

"تمیز سے بات کر"

پیادے نے منیر کے گال پر تاک سے تھپڑ دیا۔

منیر نے دل کی طرف دیکھا۔ بھاگوان منتھنی سے جو نگاہیں چار ہوئیں تو اپنی اس ذلت پر عرق عرق ہو گیا۔ اور سر جھکا کر محل کے اندر چلا گیا۔

سوامی جی اور پنڈت جی لاٹھیاں کھانے پر بھی جب نہ ہٹے تو ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور مجمع منتشر کر دیا گیا۔ یہ قصہ پاک کر کے حاکم صاحب منیر کے دادا میاں سے ملنے آئے۔ منیر سے اس طرح ملے۔ گویا ان کو منیر کے بارے میں کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ پھر کہنے لگے۔

"میاں کن جھگڑوں میں پڑے ہو۔ چلو تم کو ہوا بازی میں کپتان بنوا دوں"

دادا میاں نے سنتے ہی کہا۔

"واہ واہ! کیسی اچھی تجویز ہے ڈپٹی صاحب کی"

خوش ہو کر دادا میاں ہنسے۔ ان کا منہ خالی پرس کی طرح کھل گیا۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے منیر کے معاملے میں دخل دیا تھا۔

حاکم نے دادا میاں کی مرضی پا کر کہا۔

"پھر تم اپنے فرائض کو نبھا سکو گے۔ محل کی مرمت کرانا۔ دادا میاں کے لئے جوانی کو پھر واپس لانے والی دوائیں لانا۔

نیک فال کی بات سن کر سب خوش ہو گئے۔ حالانکہ دل ہر ایک کا یہی کہتا تھا کہ اب ان دواؤں کا وقت گزر چکا ہے۔

حاکم نے اپنی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ "اور چاند کی ایسی بہانی سے گلابی بالاخانہ بسانا۔"

منیر نے مشورے کے لئے اپنے جنم اور مرن کے سنگھی کی طرف دیکھا۔ بہادر دل کی طرف۔ جو ایسے ایسے کتنے مواقع ٹھکرا چکا تھا۔ مگر اس وقت، خالی پڑا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

دل میں ایسا سناٹا پاکر منیر گھبرا کر پکارنے لگا۔

"تم کہاں ہو؟ تم کہاں ہو میرے بہادر حوصلو۔ تم تو گاؤں کے زمین و آسمان بدلنے نکلے تھے۔ تم تو اس راہ میں محل کی اینٹ سے اینٹ لٹانے کو تیار تھے۔ تم تو جان ہتھیلی پر لئے گھومتے تھے۔ کہاں گئے؟ کدھر گئے؟ مجھے یوں نہ چھوڑ جاؤ غداری کے جہنم میں نہ دھکیلو۔"

کوئی جواب نہ ملا۔ اب دل کی بستی صرف، ایک تھی۔ بھاگوان ہتھنی۔ اس نے سنہرے لچکے والی جھالر کا گھونگھٹ کھینچ لیا۔ اوٹ سے ترچھے نینوں کے بان مارے۔ اور ظالمانہ ادا سے مسکرادی۔

منیر کو خاموش دیکھ کر دادامیاں نے کہا۔

"بیٹا منیر تم کو تو پرواز کا ہمیشہ سے شوق ہے۔"

سچ ہے منیر کو آسمان پر اڑنے کی ہمیشہ تمنا تھی۔ یہی تمنا سبا ست میں لے گئی تھی۔ اور اب یہی تمنا کچھ اور کہہ رہی تھی۔ منیر اپنا ہونٹ چبانے لگا وہی پرانی عادت۔

منیر باہر سے اندر آیا۔ شاید پھر یاں سے کچھ سہارا پاؤں۔ جو یہ سنہرا جال توڑ نکلوں۔ ماں کو خبر مل چکی تھی۔ بیٹے کی آنکھیں چار ہوئیں ماں سے! اماں تو وہی پرانی اماں ہو گئیں۔ پردے جو ادھر چند برسوں سے

ماں بیٹے کے بیچ پڑ گئے تھے اٹھ چکے تھے۔ اب وہ وہی تھی بیٹے کے ارمانوں کی سچی تصویر۔

ماں کے چہرے کی تمام جھریاں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ آنکھوں میں مستقبل کی امیدیں رقص کر رہی تھیں۔ جو حالت باہر کی تھی وہی اندر کی۔ جو اندر کی تھی۔ وہی باہر کی۔

منیرا اپنے بچپن کے دوست ڈپٹی صاحب کے برابر موٹر میں بیٹھ کر چل دیا۔ بدلو اور دوسرے کسانوں کے لئے جو گھاتی ہاتھ پاؤں لئے مورچے سے واپس آکر محل کے سامنے جمع ہو گئے تھے آسمان کو چھپا لینے والا ڈھول کا پہاڑ چھوڑ گیا۔

بہت ہی باعزّت

(۱)

ابھی سورج نے منہ نکالا ہی تھا کہ ہماری لاری مہاکوسی ڈیم کے پاس پہنچ گئی۔ اور جو دو چار مسافر اس میں رہ گئے تھے وہ میرے ساتھ اتر پڑے۔

مہاکوسی ندی شمال کی طرف بلند و بالا اور بے حد شاداب درختوں کے جھنڈ میں گم ہوتی ہوئی اوپر جاکر غائب ہو گئی تھی۔ ان کے پیچھے بہت دور بادلوں کے بیچ میں شوالک پہاڑیوں کی دو چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

جب میں دو فرلانگ چل کر ٹوٹے ہوئے بند کے پاس پہنچا تو ایک دم سے جنوب کی طرف کا منظر بھی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جو ابھی تک درختوں سے چھپا ہوا تھا۔

اس منظر کو بیس سال پہلے میں گھنٹوں دیکھتا رہتا تھا اور جی نہیں

بھر تا تھا۔ یہاں کوسی ندی نیچے کی طرف بہت دور تک جنگلی جھاڑیوں، کھیتوں اور باغوں میں بل کھاتی ہوئی جاتی نظر آتی تھی۔ اس کے کنارے پر چھوٹے چھوٹے دیہات آباد تھے۔ جن سے قدرتی حسن میں انسانی چہل پہل شامل ہو گئی تھی۔ میں یہاں سے دیکھ سکتا تھا کہ ندی کے کنارے جگہ جگہ پر دھوبی کپڑے دھو رہے ہیں۔ اور چرواہے مویشیوں کو چرا رہے ہیں۔ کبھی کبھار کسی کے پکارنے کی صدا یا کسی چرواہے کی تان بھی کانوں میں آ جاتی تھی۔ مگر جنگل کی صداؤں میں گھل مل کر۔

چچا جان صرف اپنوں ہی میں نہیں غیروں میں بھی بہت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کیونکہ ان کا مزاج ہی کچھ عجیب و غریب تھا۔ ایک دن وہ اسٹیشن پر کسی کو لینے گئے تھے کہ ایک لڑکے کو دیکھا جو پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ انہوں نے ملازم سے کہا کہ اس کو بلا لاؤ۔

لڑکا آ گیا جو اس اچانک بلاوے سے گھبرا گیا تھا۔

چچا جان۔ "بیٹا تم کس کے لڑکے ہو؟"

"سیٹھ رام داس جی کا بیٹا ہوں؟"

"میں ٹھیک سمجھا تھا۔ کہاں جا رہے ہو؟"

"کلکتے"۔

"کیوں؟"

لڑکا بظاہر ایسے سوالات کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ جواب دینے میں ذرا جھجکا۔ چچا جان کہنے لگے۔

مُبرا اس طرح پوچھنا نئی تہذیب کے خلاف ہے۔ مگر میں تو پرانے زمانے کا آدمی ہوں۔ ہاں بیٹا بتلاؤ"۔

چچا جان کے لہجے میں کچھ ایسی شفقت تھی کہ لڑکا گھبرا گیا اور بولا۔

" نوکری ڈھونڈنے"۔

"خدا کرے کامیابی ہو۔ کتنے پیسے لے کر چلے ہو"

لڑکے کے چہرے پر کچھ ہچکچاہٹ اور کچھ جھینپ کے آثار پیدا ہوئے لیکن اس نے بتا دیا۔ "تیس روپیہ"۔

" چل بے تیس روپلی لے کے چلا ہے کلکتے"۔

چچا جان نے جیب سے سو روپے نکال کر لڑکے کے ہاتھ میں دے دیئے اور کہنے لگے۔ " تمہارے باپ سے میرا بڑا یارانہ ہے اس لئے تم میرے بیٹے ہو۔ میں نے تم کو اس وقت دیکھا تھا جب تمہارے پتا جی کا کاروبار چلتا تھا اور تم آٹھ سال کے تھے۔ اور اب ماشاء اللہ سترہ اٹھارہ سال کے ہو گئے ہو۔ لیکن میری یادداشت نے ساتھ دیا اور میں نے پہچان لیا"۔

پھر چچا جان نے وہیں کھڑے کھڑے دو تعارفی خط اپنے دوستوں کے نام لکھ کر لڑکے کو دیئے۔ اور کہا۔ "یہ تمہارے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیں گے۔ اور نوکری کی بھی کوشش کریں گے"۔ انہوں نے لڑکے کو ریل پر سوار کیا اور چلتے وقت کہا۔

" اگر کوئی ضرورت ہو تو اپنے پتا جی کے بجائے مجھے لکھنا"۔

چچا جان کا گھر، گھر نہیں۔ مسافر خانہ معلوم ہوتا تھا۔ کچھ نہ ہوں گے تو چھوٹے بڑے ملا کر ڈیڑھ درجن تو بچے ہی ہوں گے۔ ان باشندوں میں چچا جان کا خاندان صرف ان کی بیوی اور دو لڑکیوں پر مشتمل تھا جن

میں سے ایک بیوہ تھی اور دوسری کا شوہر نکھٹو تھا۔ باقی ساری آبادی ان عزیزوں سے مرکب تھی جن کا معزز پیشہ بھکاری پن تھا۔ ایسے لوگ کسی تقریب میں شرکت کے لیے دو چار روز کے لیئے آتے اور رہ پڑتے اگر بیوی بچے ساتھ نہ ہوتے تو سال چھ مہینے بعد ان کو بھی لے آتے۔ اور پھر اس خاندان کے جزو بن کر جانے کا نام تک نہ لیتے۔

میں بھی اسی طرح چچا جان کے گھرانے کا ممبر بنا تھا۔ میرے ابا جان چچا جان کے سگے بڑے بھائی تھے۔ کچہری میں عرائض نویسی کرتے تھے۔ معمولی سی آمدنی تھی اور کنبہ کافی تھا۔ جب انہوں نے ہائی اسکول میں میری کامیابی کی خبر سنی تو سجدے میں گر پڑے اور پھر اٹھ کر میرا باتھ پکڑا اور ریل کا ٹکٹ لے کر سیدھے چچا جان کے پاس آئے اور کہنے لگے۔

"لو تمہارے بھتیجے نے ماشاءاللہ ہائی اسکول سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا ہے۔ اب تمہارا جی چاہے تو اس کو آگے پڑھاؤ، اور جی چاہے تو کہیں نوکر رکھا دو۔ مجھے اب کوئی مطلب نہیں۔"

چچا جان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔

"میرا دستر خوان غیروں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ پھر اس کا کیا اور یہ تو پھر اپنا ہے۔ کیوں بیٹا تمہارا کیا سن ہے؟"

"جی۔ سولہ برس۔"

چچا جان "تب تو ابھی چھوٹے ہو۔ شرارت کے دن ہیں۔ دیکھو گھر کو اپنا ہی گھر سمجھنا۔ اور جتنی جی چاہے شرارتیں کرنا اور جب جی چاہے اپنی چچی سے چار آنے آٹھ آنے اٹھنّی کو مانگ لینا۔"

آپ ہی بتلائیے کہ اس ملاقات کا میرے اوپر کیا اثر پڑا ہوگا۔

اس دن سے میں چچا جان کا بیٹا ہو گیا۔ اور انہوں نے مجھے رکھا بھی بیٹوں ہی کی طرح۔

چچا جان جس زمانے میں ڈسٹرکٹ انجینیر تھے۔ ایک مرتبہ معائنہ کو جا رہے تھے۔ برسات کا خوش گوار زمانہ تھا اس لئے تفریح کی غرض سے میں بھی کار پر بیٹھ گیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ سڑک خراب تھی اور پانی بہت بھرا ہوا تھا۔ اس لئے کار دھیمی ہو گئی۔ اس وقت ہم ایک گاؤں سے گزر رہے تھے جب اس کے کنارے پر پہنچے تو دیکھا کہ کچھ لوگ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ایک بڑھیا چلا چلا کر رو رہی ہے۔ ایک جوان عورت سر نیہوڑائے کھڑی ہے۔ اور اس سے لگا ہوا دس بارہ سال کا ایک بچہ بلک بلک کر رو رہا ہے۔

چچا جان نے اس مجمع کو دیکھ کر ڈرائیور کو حکم دیا کہ کار روک لو پھر وہ نیچے اتر پڑے۔ ان کے جوتے اور ریشمی موزے اور پتلون کی مہریاں گندے پانی میں لت پت ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بھیڑ کے اندر گھس کر پوچھا کہ کیا بات ہے؟

معلوم ہوا کہ بڑھیا اور اس کی بہو دونوں بیوہ ہیں۔ بڑھیا کا ایک بارہ سال کا پوتا بھی ہے۔ جو ورناکیولر اسکول میں پڑھتا ہے۔ بڑھیا کا بیٹا فانو نگو تھا جو ایک سال ہوا جوانی میں گزر گیا۔ اس کی موت سے یہ گھرانہ بے سہارا ہو گیا۔ صرف ایک کچا گھر تھا جس میں یہ رہتے تھے۔ اور ایک بھینس تھی جس کا دودھ بیچ کر یہ لوگ گزارہ کرتے تھے لیکن ابھی ایک گھنٹہ ہوا گھر گر گیا جس سے دب کر بھینس مر گئی۔

چچا جان وہیں ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔ اور کار بھیج کر نہر کے اوور سیر

کو بلا بھیجا۔ اس کو انہوں نے اسی وقت ایک چک لکھ دیا۔ اور کہا کہ پندرہ دن کے اندر اندر بڑھیا کا مکان بن جانا چاہیئے۔ اور ایک بہت عمدہ جمنا پاری بھینس آجانا چاہیئے۔ اگلے دورہ پر جب میں آؤں گا تو ان دونوں چیزوں کا بھی معائنہ کروں گا۔

پھر چچا جان بڑھیا کے پوتے کو کار پر لے کر اس علاقے کے تعلقہ دار کے پاس گئے۔ جو ان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اور ان سے کہا کہ اس لڑکے کی پڑھائی کا مناسب بندوبست کر دیجیئے۔ اس واقعہ کی شہرت دور دور پہنچی اور لوگ چچا جان کا دیوتا کی طرح احترام کرنے لگے۔

(۲)

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ چچا جان کی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ نماز کے بڑے پابند تھے۔ بلکہ کبھی تو مہینوں تک مسلسل تہجد بھی ادا کرتے رہتے تھے۔ تہجد کا شوق عام طور سے ان کو چلے کے جاڑوں میں ہو جاتا تھا۔ جبکہ بڑے بڑے تہجد گزار ٹال مٹول کرنے لگتے ہیں۔ اور وہ بھی عجیب انداز سے۔ کبھی تو تہجد کا اتنا اہتمام ہوتا کہ اس کے لیئے رات بھر کئی من لکڑیاں جلا کر حمام اور کمرہ گرم کیا جاتا۔ چچا جان تین بجے اٹھ کر حمام میں جاتے۔ وہاں غسل کرتے اور پھر گرم کمرے میں آتے اور ساڑھے چار بجے تک نماز ادا کرتے اور گا گا کر مثنوی مولانا روم پڑھتے۔ اور کبھی ایسا ہوتا کہ ایک دم سے سب سامان آسائش چھوڑ دیتے۔ اور کڑکڑاتے جاڑوں میں تین بجے رات کو اٹھ کر صحن میں رکھے ہوئے ٹھنڈے گھڑوں سے غسل کرتے اور کمبل اوڑھ کر برآمدے میں تہجد کی نماز ادا کرتے۔

چچا جان حج کو نور بیمار ہونے کے بعد گئے۔ لیکن اجمیر شریف ہر سال پابندی سے جایا کرتے تھے۔ اس کا بھی بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ کھانے پینے کا ساز و سامان۔ غذا کے درجنوں ڈبے۔ پھل۔ بڑے بڑے تھرماسوں میں برف اور چائے۔ ساتھ دو تین ملازم۔ اس ٹھاٹھ سے چچا جان اجمیر شریف جاتے تھے۔ یہ سفر کبھی کبھار ریل پر لیکن عام طور پر دو تین کاروں پر کیا جاتا تھا۔ اکثر ان کے ساتھ بیوی اور بیٹیاں بھی ہوتی تھیں۔

ایک بار اس سفر میں مَیں بھی ساتھ تھا۔ دو کاروں پر سفر ہو رہا تھا۔ اور طے یہ پایا تھا کہ دہلی گھومتے ہوئے جائیں گے۔ جس کار پر چچا جان تھے۔ وہ دہلی پہنچ کر کچھ خراب ہو گئی۔ جب مرمت کے لئے گیراج بھیجی گئی تو معلوم ہوا کہ تیاری میں تین دن صرف ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر عرس کے خاص دنوں میں شرکت کرنا ہو تو ریل سے جانا چاہیئے۔ چچا جان یہ سن کر اٹھے اور نئی دہلی سے گیارہ ہزار میں ایک نئی کار خرید لائے۔ اور سفر بلا کسی رکاوٹ کے جاری رہا۔

چچا جان جب اجمیر شریف کے قل یا قوالی میں شرکت کرتے تھے۔ تو ان پر عجب محویت کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ وہ سر جھکائے بے حس و حرکت گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ کبھی کبھی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ جو دیر تک جاری رہتی تھی۔ اور ہچکیاں بندھ جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے مزار کے سامنے سر اس زور سے ٹیکا کہ گُلم پڑ گیا۔

ان باتوں کی وجہ سے چچا جان کی ہر جگہ عزت ہوتی تھی۔ اور خدا بھی ان پر ایسا مہربان تھا کہ وہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے تھے تو سونا بن

جاتی تھی۔

(۳)

جہاں تک میرا اندازہ ہے، چچا جان جتنا بھی کماتے ان کے پاس کبھی روپیہ رہتا نہیں تھا۔ بقول چچی جان کے۔ ان کے ہاتھ میں چھید تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی رقم آتی تھی اور ہفتوں میں غائب ہو جاتی تھی۔

جب میں یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگا تو ایک ہزار روپوؤں کی ضرورت پڑی۔ میں نے چچا جان سے ایک مہینہ پہلے کہا۔ وہ بولے اچھا۔ پھر ایک ہفتہ پہلے کہا۔ پھر انہوں نے جواب دیا اچھا۔ پھر دو دن پہلے کہا انہوں نے جواب دیا۔ "انتظام کر دیا جائے گا۔" آخر جب آخری ریل کے چھوٹنے میں چھ گھنٹے رہ گئے تو میں نے پھر کہا۔ وہ ذرا متفکر ہو گئے پھر کہنے لگے۔

"سیٹھ رام داس کو ٹیلی فون کر کے بلا لو۔ اور آدمی کو خزانچی اور اوورسیر کو بلانے بھیج دو۔"

ایک گھنٹے میں یہ تینوں اکٹھا ہو گئے۔ اور میرے سامنے اس طرح کارروائی شروع ہوئی۔

چچا جان۔ خزانچی صاحب۔ فوری ضرورت کی مد میں آپ کی تحویل میں کتنا روپیہ ہے؟

خزانچی۔ ساڑھے سولہ سو۔

چچا جان۔ ہوں ــــ (ذرا سوچ کر) کیوں اوورسیر صاحب بیلی گاؤں کی نہر کے پاس کچھ ملبہ اکٹھا ہو گیا ہے جس سے پل بند ہو گیا ہے اور اس کو سخت خطرہ ہے۔ اس ملبے کی صفائی کی فوری ضرورت ہے۔

اوورسیر۔ جی ہاں حضور۔

چچا جان۔ پھر اس کی رپورٹ اور تخمینہ پیش کیجئے۔

اوورسیر نے خوشی خوشی پانچ منٹ میں یہ دونوں چیزیں تیار کر دیں۔

چچا جان۔ (سیٹھ صاحب سے) کیوں ٹھیکہ دار صاحب۔ آپ یہ کام کتنے میں کر سکتے ہیں؟

سیٹھ صاحب۔ (سب کی طرف دیکھ کر) ساڑھے سولہ سو میں۔

چچا جان۔ ٹنڈر لائیے۔

سیٹھ جی نے اسی وقت ٹنڈر لکھ کر دے دیا۔ چچا جان نے اس پر منظور لکھ کر دستخط کر دیئے۔ پھر کہنے لگے۔

" اوورسیر صاحب نہر کی جانچ کیجئے کہ وہ صاف ہو گئی ہے یا نہیں اور پھر رپورٹ پیش کیجئے۔"

اوورسیر نے رپورٹ پیش کر دی۔ چچا جان نے اس پر منظور لکھ کر دستخط کر دیئے۔ پھر سیٹھ صاحب نے ساڑھے سولہ سو کا بل پیش کیا۔ چچا جان نے "فوراً ادا کر دیا جائے" لکھ کر اس پر دستخط کر دیئے۔ خزانچی نے کل روپیہ چچا جان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ انہوں نے اس میں سے ایک ہزار نکال کر مجھے دے دیا اور پھر اٹھ کر کمرے سے چلے گئے۔ جو روپیہ بچ رہا تھا اس کو انہوں نے کسی خاص قاعدہ کے مطابق آپس میں بانٹ لیا اور چچا جان کو دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔

(۴)

ایک مرتبہ چچا جان پر بڑا سخت وقت پڑا۔ مگر کیا ہمت تھی کہ انہوں نے آخر وقت تک امید اور کوشش کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ کامیاب ہو گئے۔

جب ان کی چھوٹی لڑکی کی شادی ہونے والی تھی۔ اس وقت بھی روپیہ کی حسب دستور سخت کمی تھی۔ چچا جان ایک ہفتہ سے فکرمند تھے۔ ایک دن انہوں نے دو تین سیٹھوں، نہر کے انجنیر، خزانچی اور کچھ اور معززین کو بند کمرے میں اکٹھا کیا۔ دن بھر بڑی سخت مصروفیت رہی۔ نقشے بنائے گئے، فارم چھپوائے گئے ادھر ان کے خانے بھرے گئے۔ ملازم اور چپراسی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ شام کے قریب یہ جلسہ برخاست ہوا۔ اور چچا جان خوش خوش گھر کے اندر آئے۔ اور چچی جان سے کہنے لگے۔ اب پرسوں تمہارا گھر روپوں سے بھر جائے گا۔

شادی تو تھی ہی۔ روزانہ گانا بجانا ہونا ہی تھا لیکن اس دن بہت زور وشور سے گانا بجانا ہوا۔ اور چچا جان نے بھی خلاف دستور اس میں دلچسپی لی اور رات گئے تک جاگتے رہے۔

دوسرے دن سہ پہر کو چچا جان کو ایک تار ملا۔ اس کو پڑھتے ہی اُن کے منہ سے نکلا۔

"اے خدا رحم"۔

پھر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ میں اور منشی جی جو ان کے پاس بیٹھے تھے۔ گھبرا گئے۔ دس منٹ کے بعد چچا جان عزم وارادے کے پتلے بن کر اٹھے۔ اور مجھ سے کہنے لگے۔

"بیٹا۔ فوراً کار لے کر جاؤ۔ اور سیٹھ مکھن لال کو اپنے ساتھ لے آؤ۔ کہنا۔ بے حد ضروری کام ہے"۔

پھر منشی جی کو حکم دیا۔ تم جا کر فلاں فلاں کو بلا لاؤ۔

میں نے سیٹھ جی سے کہا تو وہ جس حالت میں بیٹھے تھے ویسے چلے آئے۔

چچا جان ان کی صورت دیکھتے ہی کہنے لگے ۔
"سیٹھ جی غضب ہو گیا ۔ کل صبح چیف انجینئر معائنہ کے لیے آ رہا ہے"۔
سیٹھ جی یہ سن کر گھبرا گئے اور کہنے لگے ۔
"یہ تو بُرا ہوا کسی بدمعاش نے چغلی کھا دی "۔
چچا جان ۔ "میرا بھی ایسا ہی خیال ہے ۔ اس وقت مجھے ساٹھ ہزار روپوؤں کی فوری ضرورت ہے ۔ جس طرح بنے اور جتنے سود اور جن شرائط پر بھی ممکن ہو آپ فوراً مہیا کر دیجئے ۔ اس کی ضمانت میری کوٹھیوں اور کاروں میں سے جو چاہے رہن رکھ لیجئے ۔ یا خرید لیجئے ۔ یا مجھ سے پرونوٹ لکھوا لیجئے ۔ بہر حال میں ہر چیز کے لئے تیار ہوں ۔ مجھے روپیہ چاہیئے "۔
سیٹھ جی نے معاملہ پر غور کیا ۔ پھر بہت شرافت دکھلائی اور کہنے لگے ۔
"مجھے آپ کی بدولت بہت کچھ مل چکا ہے ۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آج آپ کی حالت سے فائدہ اٹھا کر آپ کی کوٹھیوں یا کاروں پر قبضہ کر لوں ۔ آپ دو سطریں لکھ دیجئے ۔ روپیہ حاضر ہے "۔
چچا جان نے اپنے ذہن میں کام کا پورا نقشہ تیار کر لیا تھا ۔ روپیہ پاتے ہی انہوں نے سب سے پہلے مجھے حکم دیا کہ اجمیر کے فلاں بزرگ کو تار دے دوں کہ بُرا وقت پڑا ہے ۔ مزار پر جا کر دستگیری کی درخواست کیجئے ۔ پھر وہ خود کار پر بیٹھ کر مزاروں کی حاضری کے لئے نکل گئے ۔
شام کے قریب جب وہ گھر واپس آئے تو وہ سب لوگ جن کو انہوں نے بلوایا تھا ۔ وہاں موجود تھے ۔ چچا جان نے ان سب پر نظر ڈالی ۔ اور

کہنے لگے "بہت ضروری اور فوری کام ہے۔ ڈگنی مزدوری اور کرایہ۔ انعام الگ سے!"

پھر انہوں نے ٹھیکہ داروں سے کہا کہ جتنے مزدور اور جتنے ٹرک ممکن ہوں ان کو فلاں جگہ نہر پر فوراً بھجوا دیجئے۔ اور سپروں کو حکم دیا کہ وہ فوراً موقع پر پہنچ جائیں۔"

چچا جان دستور کے مطابق صرف حکم دے کر بیٹھ نہیں رہے بلکہ ان کی تعمیل کرانے کا پر خود باری باری ہر ایک کے یہاں پہنچ گئے۔ ایک ٹھیکہ دار کے مزدور کام پر جانے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ چچا جان نے فوراً دو دو روپے ان میں تقسیم کر دیئے۔ اور کہا کہ یہ مزدوری کے علاوہ ہیں بس پھر کیا تھا۔ سب فوراً روانہ ہو گئے۔

گیس کے ہنڈے والے کے یہاں گئے۔ تو وہ ٹھیکہ دار سے عذر کر رہا تھا کہ مینٹل سب ٹوٹے ہوئے ہیں اور رات زیادہ آگئی ہے۔ بازار بند ہو چکا ہے۔ اس لیے مینٹل خریدے بھی نہیں جا سکتے ہیں۔ چچا جان نے فوراً جا کر ایک دکان کھلوائی۔ اور ایک گرس مینٹل دس گنے داموں پر خرید لئے۔

تقریباً گیارہ بجے رات تک مزدور مع ساز و سامان کے ٹرکوں پر لد لد کر نہر پر پہنچ گئے۔ ان مزدوروں کو چار میل میں پھیلا دیا گیا۔ گیس کے ہنڈے مسلسل نصب کر دیئے گئے۔ اور حکم دیا گیا کہ ٹرک مٹی بھر بھر کر لائیں گے۔ مزدور ان کو ڈلیا میں لے جا کر نہر میں جس میں پانی نہیں تھا ڈالیں گے۔

کام شروع ہو گیا۔ ٹرکوں پر مٹی آنے لگی۔ اور نہر میں ڈالی جانے لگی۔ چچا جان کار پر دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ جہاں کام میں خامی نظر آتی اس کو دور کرتے۔ اور جو ٹھیکہ دار یا مزدور اچھا کام کرتا نظر آتا اس کو کبھی پانچ کا اور

کبھی دس کا نوٹ تھما دیتے۔ اس طرح انہوں نے نہ تقسیم کئے ہوں گے تو دس ہزار کے نوٹ تو تقسیم کر ہی دیئے ہوں گے۔

صبح پانچ بجتے بجتے کام ختم ہو گیا۔ مزدور سب سامان لے کر سڑکوں پر چلے گئے۔ بہت دیدہ ریزی سے تمام نشانات مٹا دیئے گئے۔ ساڑھے پانچ بجے تک نہر میں پانی آ گیا۔

چچا جان نے رات کو گیارہ بجے اپنی کار پر ایک ہرکارے کو نہر کے بند پر جو نوتے میل پر تھا یہ حکم دے کر بھیج دیا تھا کہ نہر کا پانی ٹھیک ساڑھے چار بجے کھول دیا جائے۔ ہرکارے کو یہ بھی حکم دیا تھا کہ بند سے آدھ میل پہلے کار سے اتر جانا۔ اور بند کے اوورسیر سے کہنا کہ میں ریل سے آ رہا ہوں۔

صبح چھ بجے چچا جان گرد و غبار میں اٹے ہوئے گھر آ گئے۔ اور غسل خانے چلے گئے۔ ادھر وہ غسل خانے گئے ہیں اور ادھر چیف انجنیر صاحب مع اپنے اسٹاف کے آن پہنچے۔ میں نے ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھلایا۔

چیف انجنیر کے چہرے پر جو ولایت پلٹ نوجوان تھا عجیب شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔ اور میں اس مسکراہٹ پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کیونکہ مجھے اپنی جگہ یقین تھا کہ چچا جان کی جیت ہو چکی ہے۔

چچا جان آ گئے۔ پھر چائے آئی۔ چائے کے بعد چچا جان نے کہا۔

"حضور آپ کا تار مجھے کل چار بجے ملا اور میں دو بجے کی گاڑی سے ہرکارے کو یہ حکم دے کر بھیج چکا تھا کہ نہر کا پانی کھول دیا جائے۔ تار پانے کے بعد اس حکم کو نہ روکا جا سکا کیونکہ ٹیلی فون کی لائن خراب تھی۔"

چیف انجنیر نے لاپروائی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم گز ڈال کر سطح کو ناپ لیں گے۔"

ڈیڑھ بجے چیف انجنیر مع چچا جان کے نہر سے واپس آیا تو اس کے چہرہ پر کچھ حیرت اور کچھ شرمندگی تھی۔ کھانے کی میز پر کہنے لگا۔

"آپ بڑے ہوشیار ہیں"

میں اندازہ نہ کر سکا کہ اس جملہ میں طنز تھا یا تعریف۔

چچا جان نے ادب سے جواب دیا۔

"جی میں کس لائق ہوں۔ آپ لوگوں کی صحبت کا اثر ہے"

پھر ذرا دیر کے بعد چیف انجنیر نے کہا۔

"کہیں کہیں تو ٹی آپ کے تخمینہ سے بھی زیادہ نکلی"

"غالباً پانی آجانے سے ایسا ہو گیا"

چیف انجنیر کے جانے کے بعد چچا جان نے نہ صرف بڑی دھوم دھام سے بزرگوں کی نذر نیاز کی۔ بلکہ سینکڑوں روپیہ کی خیرات بانٹی۔

شہر والوں کو پوری بات تو معلوم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کچھ سن گن لگ گئی تھی۔ کہ اوپر کی آمدنی کے سلسلے میں انجنیر صاحب کو کچھ پریشانی ہو گئی ہے۔ جب ان کو نذر نیاز کی خبر ملی تو مبارکباد دینے آئے۔ آنے والوں میں سرکاری افسران۔ شرفاء اور مذہبی پیشوا سب ہی طرح کے لوگ تھے۔

(۵)

چچا جان کا آخری اور سب سے شاندار کارنامہ مہاکوسی ڈیم تھا۔ جس کی تعمیر میں انہوں نے پانچ سال صرف کئے تھے۔ اور جس کے سلسلے میں انہوں نے تین انگریزوں کو ایک مہینہ ہمالیہ کی وادیوں میں شکار کھلایا تھا۔ کہ جنگل میں منگل کر دیا تھا۔ کیمپ پر شہر سے برف میں لگی ہوئی شراب

اور سوڈے کی بوتلیں روزانہ جاتی تھیں اور ہر دوسرے تیسرے وہاں محفلِ رقص و سرود بھی گرم ہوتی تھی۔

اس بند کا بنیادی پتھر سرکاری طور پر گورنر نے رکھا تھا لیکن حقیقی طور پر چار صاحبوں نے رکھا تھا جن کو چچا جان نے اجمیر شریف اور دوسرے متبرک مقاموں سے بلوایا تھا۔ کیونکہ چچا جان کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ اس بند کو ان کے منصوبے کے مطابق دو سو برس تک چلنا چاہیئے اور ان کا خیال تھا کہ یہ طاقت سیمنٹ میں نہیں صرف بزرگوں کی دعاؤں میں ہے۔ جو بند کو اتنے زمانے تک برقرار رکھ سکتی ہے۔

چچا جان نے مضبوطی کے خیال سے سیمنٹ ایک خاص انگریزی کارخانے کی منظور کی تھی۔ ایک مرتبہ چچا جان معائنہ کر رہے تھے کہ اوورسیروں کے سامنے ایک ٹھیکہ دار کہنے لگا۔

"حضور جو سیمنٹ آ رہی ہے اس میں میل ہے"

چچا جان نے ڈانٹ کر کہا۔

"کیا بکتا ہے۔ یہ سیمنٹ خاص انگریزی کارخانے کی ہے"

پھر اوورسیروں نے اس گدھے کی خوب خبر لی۔

چچا جان کو مہاکوسی ڈیم کی تعمیر کے سلسلے میں جو اس جگہ پانچ سال رہنا پڑا تو ان کو اس جگہ سے محبت ہو گئی۔ ایک دن وہ مجھ سے اور اپنے چھوٹے بھائی سے کہنے لگے۔

"مرنے کے بعد مجھے یہیں دفن کرنا"

پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے۔

"وہ ٹیلا مناسب رہے گا"

ہم لوگ چچا جان کے جذبات کو سمجھ گئے۔ ایک تو مقام پُر فضا تھا اور دوسرے چچا جان کا شاہکار مہاکوسی ڈیم وہیں واقع تھا اگر وہاں قبر بنے گی تو آنے جانے والے ڈیم کے ساتھ اس کے بنانے والے کی قبر کی بھی زیارت کر سکیں گے۔ لیکن جب ٹیلے کی طرف انہوں نے اشارہ کیا تھا وہ آس پاس کی جگہوں کو دیکھتے ہوئے ویرانہ تھا۔ اس انتخاب پر ہم دونوں کو بہت حیرت ہوئی لیکن دفن کی بات تھی اس لئے کچھ کہتے نہ بنا۔

آج میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ کتنے دور نظر تھے اور کتنے پتے کی بات کہی تھی انہوں نے۔ اگر آج ان کی قبر اس ٹیلے پر بنی ہوتی تو ڈیم کے ٹوٹ جانے سے جو سیلاب آیا تھا اس کی شکار نہ ہوتی۔

(۶)

مہاکوسی ڈیم کے ٹوٹنے کی خبر میں نے جب اخبار میں پڑھی تو اک دم سے چچا جان یاد آ گئے۔ اور دل نے کہا کہ پندرہ سال ہوئے جب میں نے ان کو نذر خاک کیا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ایک بار بھی تو قبر پر فاتحہ پڑھنے نہیں گیا۔ اب تو بلا چلے قرار نہ آئے گا۔ یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ ان کی قبر کو کوئی صدمہ تو نہیں پہنچا۔

جب میں ڈیڑھ دن ریل اور لاری کا سفر کر کے یہاں پہنچا تو یہ افسوسناک نظارہ دیکھا کہ بند کے ساتھ بنانے والے کا بھی نام و نشان غائب ہو گیا ہے۔

آج مہاکوسی ندی کے نیچے کا نظارہ کتنا مختلف ہے۔ باغوں کے

درخت اکھڑ گئے ہیں۔ کھیت بہہ گئے ہیں۔ دیہات ٹوٹی ہوئی دیواروں اور سڑے گلے چھپروں کے ڈھیر بن گئے ہیں۔ نہ کہیں دھوبی نظر آتے ہیں نہ چرواہے۔ نہ صدائیں ہیں اور نہ تانیں۔ انسانوں کے بجائے گدھوں کی ٹولیاں جگہ جگہ نظر آرہی ہیں۔ جو غالباً ان مویشیوں کی لاشوں کو کھا رہی ہیں۔ جو سیلاب میں ڈوب مرے تھے۔ یا ہو سکتا ہے وہ لاشیں انسانوں ہی کی ہوں جن کو ابھی تک ریلیف ورک والے ہٹا نہ سکے ہوں۔

ڈیم کے دو در ٹوٹے ہوئے ہیں اور ندی کا پانی ان سے کچھ ایسے شور سے نکل رہا ہے جو پہلے کی طرح خوشی کی چیخوں سے نہیں بلکہ گریہ و زاری اور بین سے زیادہ مشابہ ہے۔

ندی کے نیچے ایک فرلانگ پر . . . ایک جھاڑی سے بہت سا آخور اور کسی جانور کی لاش الجھی ہوئی نظر آرہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے ہو نہ ہو اسی جگہ چچا جان کی قبر ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

موزوں کا کارخانہ

(۱)

ہوٹل اوسط درجے کا تھا اور جس کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا وہ چھوٹا سا تھا۔ لیکن اس پر بھی جگہ مجھے پسند آگئی۔ کیونکہ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ اور سڑک اور کارخانوں کے شور اور ہنگاموں سے محفوظ تھا بمبئی آنے کے بعد پہلا موقع تھا کہ مجھے سکوت اور سکون ملا تھا جن میں دماغی کام کیا جاسکتا ہے۔

دراصل میں نے پبلشر سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ میرے رہنے کا مناسب انتظام نہیں کرتا ہے تو مجھ سے کام نہیں ہوسکے گا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد میرا کام ختم ہو جائے۔ تاکہ کتاب مقررہ وقت تک چھپ کر تیار ہو جائے۔ اور حکومت ہند کی بنائی ہوئی کمیٹی کے سامنے پیش کی جاسکے۔ یہ وہ کتاب تھی جس کو میں نے بارہ تیرہ برس

میں تیار کیا تھا۔ اور جس کے عشق میں شادی کو طلاق دے دی تھی لیکن اس پر بھی دس سال کی امیدواری بھی اس کو چھپنے کی عزت نہ دلا سکی تھی۔ کیونکہ کوئی پبلشر اپنا روپیہ ایسی ٹھوس کتابوں میں پھنسانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ تو کہو ہندی نے انگریزی کی جگہ لے لی اور حکومت ہند ایسی کتابوں کے خریدنے پر تیار ہو گئی اس لئے پبلشر کو میرا خیال آیا اور اس نے تار بھیج کر مجھے بلایا اور بہت اچھے شرائط پر مجھ سے سودا کر لیا۔

کمرے میں آکر میں نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا۔ چائے منگائی آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ اور سکون اور سناٹے کا لطف اٹھانے لگا۔ کبھی کبھی دزدیدہ نظروں سے اپنے مسودے دیکھ لیتا۔ اور ذہن میں کام کرنے کا نقشہ بنانے لگتا۔ میں اس پر لطف فضا میں ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مجھے بے چین کر رہی ہو۔ اپنے پُر لطف خواب سے چونک کر میں ڈھونڈنے لگا کہ وہ چیز کیا ہے۔ وہ چیز تھی کسی بچے کے رونے کی آواز۔ میں نے کہا۔ اونہہ۔ بچے تو روتے ہی رہتے ہیں۔ اس سے مجھے کیا سروکار۔ پھر اپنے خواب میں ڈوب گیا۔

تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو گیا۔ اور میں نے روشنی جلا کر اپنا مسودہ کھولا۔ اور اس میں ڈوب گیا۔ لیکن جو بے چینی دماغ میں پیدا ہو گئی تھی وہ بدستور باقی رہی۔ کیونکہ بچہ برابر رو رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو اس وقت آٹھ بج رہے تھے۔ میں نے حساب لگایا تو نتیجہ برآمد ہوا کہ بچہ اسی طرح دو گھنٹے سے رو رہا ہے

میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ کچھ بیمار ہو گا۔

میں نے نو بجے کھانا کھایا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ بچہ اپنے کام میں مسلسل لگا ہوا تھا۔

مجھے ٹھیک وقت نہیں معلوم لیکن کم سے کم دس ساڑھے دس بجے رات تک تو اس نے یہ فرض پوری ذمہ داری سے انجام دیا۔

دو تین دن میں بچے کے معمولات اور ٹائم ٹیبل کا اندازہ ہو گیا وہ دن میں بھی روتا تھا اور رات میں بھی۔ دن میں دو تین بار گھنٹہ گھنٹہ بھر رو کر چپ ہو جاتا تھا۔ مگر شام کو جو رونے کا لگا لگاتا تو دس سوا دس بجے تک چپ نہ ہوتا۔ جب اس طرح ایک ہفتہ کٹ گیا تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ بچہ ہر وقت روتا رہتا ہے اور جب کبھی اتفاقاً وہ چپ ہو جاتا ہے تو اس کے سروں پر میرا کمرہ روتا رہتا ہے۔ اس طرح میرے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز گونجا کرتی تھی۔ آخر میں اتنا تنگ آ گیا کہ میں نے اپنے پبلشر کو لکھا کہ آپ نے جو سہولتیں مجھے دی ہیں وہ سب ایک بچہ کی وجہ سے ختم ہو گئی ہیں۔ جو صحت مند آواز سے ہر وقت پڑوس میں روتا رہتا ہے۔ اس لئے میرے لئے کسی دوسرے ہوٹل کا بندوبست کیجئے۔

پبلشر نے خط کے جواب میں دس سیر لیمن ڈراپ بھیج دیئے اور لکھا کہ جب تک شکر کی گولی بچہ کے منہ میں رہے گی وہ روئے گا نہیں۔ اس سمجھدار انسان نے ترکیب تو بتا دی پر یہ نہ لکھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا۔

اس جواب کے دوسرے تیسرے دن رات کو جب میں بچہ کے رونے سے بہت اکتا گیا تو، حالانکہ عادت کے مطابق ایک منٹ بھی ضائع کرنا مجھ پر کھل جاتا تھا۔ لیکن مجبوراً بالکنی پر جا کر نظریں دوڑائیں کہ دیکھوں یہ سائرن لگا کہاں پر ہے۔ اور ہو سکے تو نشانہ لگا کر ایک مٹھائی کی گولی اس میں ڈال کر تماشہ دیکھوں۔

میرے کمرے کے سامنے گلی کے اُس پار جو فلیٹ تھا اس وقت اس کی کھڑکیوں کے پردے کھلے ہوئے تھے اور اس میں وہ سائرن دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے سے باہر جانے والا دروازہ بند تھا۔ اور اندر ایک بچہ تین ساڑھے تین سال کا دروازے پر مکے مار رہا تھا اور رو رہا تھا۔ کمرے کے ایک طرف بہت سے کھلونے بے ترتیبی سے ڈھیر تھے۔

میں بچے کی صرف پیٹھ دیکھ سکتا تھا۔ اس کا جسم جس طرح رونے مکے مارنے اور التجا کرنے سے ہل رہا تھا اس کو میں دیر تک جو دیکھتا رہا تو میرے دل میں عجب طرح کا احساس پیدا ہوا۔ اور میں نے بے اختیار چمکار کر اس کو پکارا۔

"مسٹر بچے! او مسٹر بچے!"

اس نے یا تو میری آواز سنی نہیں یا پھر اس کو ناقابل التفات سمجھا۔ غرض کہ اس کے رونے اور مکے مارنے پر میری آواز کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ آخر میں نے مٹھائی کی ایک گولی نشانہ لگا کر ماردی۔ اتفاق سے نشانہ صحیح لگا۔ یعنی بس ذرا سی غلطی ہوئی۔ اور بچے کے بجائے دروازہ پر لگی۔ بچہ نے گولی اٹھالی۔ پھر اوپر کی طرف دیکھنے لگا کہ وہ کہاں سے

آئی ہے۔ میں نے پھر اس کو چمکار کر پکارا۔

"بھائی بچے!"

بچہ مڑا اور آستین سے آنسو پونچھتا ہوا میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اشارے سے اس کو اپنی طرف بلایا۔ وہ کچھ دیر تک تو خاموش رہا۔ پھر کھڑکی کی طرف آیا۔ کھڑکی اس کے سر سے اونچی تھی۔ اس لئے اس نے بہت محنت سے ایک کرسی کھڑکی کی طرف دھکیلی۔ اور پھر اس پر کھڑا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف مٹھائی کی ایک اور گولی پھینکی۔ لیکن وہ گلی میں گر گئی۔ بچے نے اس کو گرتے دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے سے افسوس ظاہر نہیں ہوا۔ وہ غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا گول گول چہرہ۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں اور لیمن ڈراپ سے چلتا ہوا منہ دیکھ کر مجھے کچھ پیار آ گیا۔ میں نے چمکار کر کہا۔

"بچے! تم اتنا روتے کیوں ہو؟"

بچے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے پھر پوچھا "بتلاؤ کیوں روتے ہو۔"

"رونا آ کر مجھے رلاتا ہے۔"

اس جواب پر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ پھر پوچھا۔

"رونا کہاں سے آتا ہے؟"

بچے نے فوراً آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں سے۔"

پھر اسے خیال آیا کہ وہ غلط کہہ رہا ہے۔ اور منہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "نہیں نہیں۔ یہاں سے۔" لیکن پھر فوراً ہی اس غلطی کی

بھی تفضیح کی اور پھر آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "نہیں نہیں دیکھئے یہیں سے"
مجھے پھر ہنسی آگئی۔ میں نے پوچھا۔ "رونا آتا کیوں ہے؟" بچے نے برجستہ جواب دیا۔
"مجھے رُلانے کے لیے"
میں نے اس کو لیمن ڈراپ دکھلائے۔ اور کہا کہ اُن کو کھانے سے رونا بھاگ جائے گا"
بچے نے انگلی سے ایک مرتبان کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا "مٹھائی وہ رکھی ہے جا ہے جتنی کھاؤ۔ وہ نہیں بھاگتا"
"اب رونا کہاں گیا؟" بچے کی آنسو بھری آنکھیں ہنس پڑیں وہ کہنے لگا۔ "وہ تو بھاگ گیا"
میں نے پوچھا: "تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟"
"کہیں رہتے ہیں۔ جب آتے ہیں تو کھلونے اور مٹھائی لاتے ہیں۔"
ممی کہاں رہتی ہیں؟"
"یہیں رہتی ہیں۔ صبح چلی جاتی ہیں۔ اور رات کو آتی ہیں۔ اور مٹھائی اور کھلونے لاتی ہیں۔"
"گھر میں اور کون رہتا ہے؟"
"نوکر رہتا ہے"
"نوکر کہاں ہے؟"
"کچن میں"

مجھے اس وقت محسوس ہوا کہ بچہ پیار کا بھوکا ہے۔
میں نے کہا۔ "اچھا اب جب رونا آئے تو مجھے بلا لینا"۔ یہ کہہ کر میں واپس لوٹنے لگا۔ بچہ افسردہ ہو گیا اور کہنے لگا۔ "آپ چلے جائیں گے تو وہ آجائے گا۔"
"میں نے کہا۔ "میں سامنے بیٹھ کر کام کروں گا۔ تم یہاں سے دیکھتے رہو۔"
میں فلیٹ کی کھڑکی کے سامنے بیٹھ کر اپنے مسودے پر نظر ثانی کرنے لگا۔
تھوڑی دیر کے بعد بچے کی طرف دیکھ لیتا۔ وہ مجھے برابر ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے بچے میں اتنا انہماک دیکھ دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ دس بجے کے قریب میری نظر اس کی طرف گئی تو وہ کھڑکی کی دہلیز سے سر ٹکائے سو رہا تھا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں نیند میں وہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر نہ گر جائے اور اس اندیشے سے میں کام نہ کر سکا۔ گیارہ بجے کے قریب کمرے کا دروازہ کھلا اور آواز آئی۔
"لارنس — لارنس!"
آواز کے ساتھ ایک سانولی سی بنی سنوری عورت جس کا سن ۲۵ - ۳۰ برس کا ہوگا اندر گھس آئی۔
عورت اونچی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ جس پر چوڑی سی پیٹی بندھی تھی۔ چہرے پر پینٹ تھا۔ لیکن اتنا نہیں کہ پینٹ کا اشتہار بن جائے۔ عورت کے پیچھے پیچھے ایک مرد تھا جو معمولی سا سوٹ

پہنے ہوئے تھا۔ اور بے فکری سے سگار کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اس کے تمتماتے ہوئے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ چڑھا کر آیا ہے
عورت نے بچے کو اس طرح جو سوتے دیکھا تو حیرت سے چلائی
"ارے کیا بات ہے۔ اچھا تو ہے؟"
پھر اس نے بچے کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اور لے جا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ میں نے کسی کی پرائیویٹ زندگی کی چھان بین کرنا مناسب نہ جان کر اپنی کھڑکی بند کر دی۔

(۲)

مجھ سے لارنس بہت ہل گیا تھا۔ اور صبح سے شام تک کھڑکی سے مجھے جھانکا کرتا۔ میں نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ میں لکھتا پڑھتا ہوں اس لئے بار بار پکارا نہ کرو۔ صرف خالی وقت ہم تم سے باتیں کیا کریں گے۔ خالی وقت سے میری مراد تھی کھانے اور چائے کا وقت۔ اس لئے بچہ ہر وقت خالی وقت کا منتظر رہتا۔ اور ادھر بیرا چائے یا کھانا لے کر آتا اور ادھر اس کی آواز آتی "اَن کِل"۔
لارنس کا یہ سن تجسس کا سن تھا۔ جب کہ بچے سوالات کا تانتا باندھ دیتے ہیں۔ ادھر میں نے کہا۔ "ہاں بیٹا" اور ادھر وہ کوئی سوال پوچھ بیٹھتا۔ میں اس کا جواب نہ دے پاتا کہ وہ دوسرا سوال پوچھ بیٹھتا۔ اور یہ سلسلہ اتنی دیر رہتا کہ اکثر میں مقررہ وقت سے پندرہ بیس منٹ بعد کام شروع کر پاتا۔
اب بچے کا رونا بہت کم ہو گیا تھا۔ دن بھر میں صرف

دو چار مرتبہ نوکر کی کسی بات سے ناراض ہوکر رونے لگتا تھا۔

نوکر نے کچھ دنوں کے بعد یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ جہاں بچہ کسی بات کی ضد کرتا تو وہ مجھے صاحب صاحب کہہ کر پکارتا۔ میں بالکنی پر جاکر لارنس کو بہلاتا۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا دیر تو ضد کرتا پھر مان جاتا کیونکہ اس بات کا بہت خوف تھا کہ کہیں میں خفا ہوکر اس سے باتیں کرنا نہ چھوڑ دوں۔ اس وجہ سے میری رضامندی کی اسے بہت فکر رہتی تھی۔

بچے کی ماں سے ابھی تک میرا تعارف نہیں ہوا تھا۔ اور نہ میں نے یا اس نے کبھی اس بات کی کوشش کی تھی۔ لیکن اجنبی پن دور ہو چکا تھا۔ اکثر سنتا تھا کہ وہ لارنس سے کہہ رہی ہے کہ "یہ کام کرلو۔ ورنہ انکل خفا ہوجائیں گے۔ اور پھر بالکنی پر آنا چھوڑ دیں گے۔"

بچے کی زندگی تھی واقعی بہت افسوسناک۔ صبح تڑکے اس کی ماں چلی جاتی تھی اور ساڑھے دس یا گیارہ بجے رات تک واپس آتی تھی۔ دن میں تین مرتبہ نوکر آکر اس کو کھانا کھلاجاتا تھا جب نوکر بازار جاتا تھا تو بچے کو کمرے میں اس واسطے بند کر جاتا تھا کہ وہ سڑک پر نہ نکل جائے اور گم نہ ہوجائے۔ بمبئی کی زندگی کچھ ایسی ہے کہ وہاں ایک فلیٹ کے رہنے والوں کو پڑوس سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے پڑوس میں یا تو بچے تھے ہی نہیں یا تھے تو ان کو پڑوس کے بچوں سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس طرح ننھا منا لارنس اپنی زندگی قیدِ تنہائی میں

کاٹ رہا تھا۔ اس کے پاس کھلونوں اور مٹھائی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن اسے ان چیزوں کی نہیں ساتھی کی ضرورت تھی۔ اور وہ اس کے پاس صرف ایک تھا یعنی میں۔

رفتہ رفتہ کھانے اور ناشتے کے علاوہ وہ بھی میں لارنس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ جب وہ ضد کرتا تو جا کر بہلانے لگتا۔ کبھی کبھار خود میرا بھی جی چاہتا اور میں جا کر بالکنی پر اس سے باتیں کرنے لگتا۔ اس طرح دن میں ایک دو گھنٹے اس کی نذر ہو جاتے۔

کچھ دنوں کے بعد لارنس اس بات کی ضد کرنے لگا کہ میں آپ کے پاس آؤں گا۔ لیکن میں یہ ضد ٹالتا رہا۔ آخر ایک دن یہ ضد بھی پوری ہو ہی گئی۔ وہ یوں کہ رات کے دس بجے ہوں گے کہ کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹایا۔ میں نے کہا۔

"کم ان"

دیکھتا کیا ہوں کہ لارنس اور اس کی ماں ہیں۔

میں حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

لارنس کی ماں شرم سے سرخ ہو گئی۔ پھر ہمت کر کے کہنے لگی۔

"ویری ساری — میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ آپ بہت بڑے پروفیسر ہیں میں جانتی ہوں۔ اس وقت آپ کو ایک بہت مجبوری سے تکلیف دے رہی ہوں۔ کیا مہربانی کر کے آج رات آپ لارنس کو اپنے پاس سلائیں گے۔ وہ نیند میں بھرا ہوا ہے۔ اور ابھی ابھی سو جائے گا۔ اور رات بھر بے خبر سوتا رہے گا۔ صبح تڑکے میں آ کر

لے جاؤں گی ۔ کچھ ایسی ہی مجبوری ہے ۔"

میں نے لارنس کی طرف دیکھا ۔ وہ بڑی امید و بیم سے میری طرف دیکھ رہا تھا ۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرف تو یہ تمنا تھی کہ میں ان کل کے پاس رہوں ۔ اور دوسری طرف ڈر رہا تھا کہ کہیں میں ڈپٹ کر نہ کہہ دوں "گٹ آوٹ" اور خفا ہو جاؤں اور اس سے باتیں کرنا چھوڑ دوں ۔ میں نے اٹھ کر لارنس کو اپنے پاس کھینچ لیا ۔ وہ خوشی سے ہنسنے لگا ۔ اور میرے گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگا ۔

"میں بالکل نہیں بولوں گا ۔ آپ کو کام کرنے دوں گا ۔ آپ کی چیزیں بھی نہیں چھوؤں گا ۔ پانی خود اٹھ کر پی لوں گا ۔ باتھ بھی خود ہی چلا جاؤں گا ۔"

اب میں نے اندازہ کیا کہ میں اس کے لئے کتنی بڑی حسرت بن گیا ہوں ۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں ۔ اور میں نے کہا ۔

"بیٹا تم شوق سے یہاں سو رہو ۔ اور تمہارا جب جی چاہے میرے پاس آجایا کرو ۔"

اس کی ماں زیر بار احسان ہو کر بولی ۔ "آپ میرے لارنس کے لئے جو کچھ کرتے ہیں اس کے لئے میں بہت بہت مشکور ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیسے شکریہ ادا کروں ۔ میں کیا کروں آپ کے لئے ۔۔۔"

میں نے کہا ۔ آپ اس کی فکر نہ کریں ۔ مجھے یہ بچہ بہت اچھا لگتا ہے ورنہ میں نے اس سے پہلے کسی بچے کو پیار نہیں کیا ۔ حالانکہ میرے بھتیجے بھتیجیاں بہت ہیں ۔"

ماں اٹھ کر جانے لگی ۔ مگر پھر دروازہ سے واپس آکر کہنے لگی : "ایک

بات ہیں اور کہہ دوں پروفیسر صاحب جو میرے دل پر پتھر کی طرح رکھی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ میں بری عورت نہیں ہوں۔ اس کے باپ نے مجھے بلاوجہ طلاق دی اور اب جس طرح بنتا ہے اپنا اور اس کا پیٹ پالتی ہوں"

جب وہ چلی گئی اور میں نے اس کی آخری بات کو ذہن میں دہرایا تو محسوس کیا کہ وہ بہت تیز قسم کا سینٹ لگائے ہوئے تھی جس کی بو ابھی تک میری ناک میں گونج رہی ہے۔

(۳)

لارنس میرے یہاں دن میں کئی کئی چکر لگاتا۔ ہوتے ہوتے اس کا یہ ڈر نکل گیا کہ میں اس سے خفا ہو کر ملنا چھوڑ سکتا ہوں اس لئے وہ شرارتیں بھی کرنے لگتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ کافی بدل گیا لیکن میں اس سے بھی زیادہ بدل گیا۔ اپنی تبدیلی کا احساس مجھے اس دن ہوا جس دن میرے ہیلبشر مجھ سے ملنے آئے تھے اور آتے ہی معذرت کرنے لگے۔

"معاف کیجئے گا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ ہوٹل کے نیچے یہ مصیبت آنے والی ہے۔ ورنہ آپ کو دوسری جگہ ٹھہرا دیتا۔ اب بھی میں فکر میں ہوں اور جیسے ہی کسی اچھی جگہ کا بندوبست ہو جائے گا آپ کو منتقل کر دوں گا۔ لیکن جگہ ملنا آسان نہیں ہے۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ آجکل ہوٹل کتنے بھرے ہوئے ہیں۔"

میں ——"آپ کس مصیبت کا تذکرہ کر رہے ہیں؟"

ہیلبشر نے ذرا حیرت سے جواب دیا۔

"یہی موزے بنیائن کا کارخانہ جو نیچے کی منزل میں قائم ہو گیا ہے

کیا اس کا شور آپ کے کام میں خلل نہیں ڈالتا ہے ؟"

"میں شور ــــ"

اتنا کہہ کر میں نے سوچا تو یاد آیا کہ ہاں عرصے سے نیچے ایک طرح کا شور ہوتا رہتا ہے ۔میں نے کہا ۔

"ہاں شور ہوتا تو ہے ۔"

"لیکن آپ کے کام میں خلل نہیں پڑتا اس سے ؟"

"بالکل نہیں ۔"

"بہت خوشی کی بات ہے ۔لیکن آپ نے تو لکھا تھا کہ کسی بچہ کا رونا تک ــــ"

"جی ہاں لکھا تو تھا ۔مگر ــــ"

اتنا کہہ کر مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا بدل گیا ہوں ۔ اتنے میں کمرے میں لارنس آگیا ۔

میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا : "مگر اس کی صحبت نے میری وہ نازک مزاجی دور کر دی اور اب میں کام بھی پہلے سے زیادہ کر سکتا ہوں"

پبلشر خوش ہو کر بولا ۔

"کیا یہ بچہ آپ ہی کا ہے ؟"

میں : "یہ تصنیف تو کسی اور کی ہے ۔لیکن میں نے اس سے انسانی عنصر حاصل کیا ہے اور اس سے میری تصنیف تالیف بن گئی ہے ۔"

(آل انڈیا ریڈیو)

سہارے کی تلاش

(۱)

ریاست منی پور کے راج محل کے شان دار باغ میں مہاراجہ کی سالگرہ منائی جا رہی تھی۔ اور ریاست کے چوٹی کے عہدہ دار، اعلیٰ افسر جاگیر دار اور معززین اکھٹے تھے۔ سالگرہ کی رسوم ادا ہو چکی تھیں۔ ایٹ ہوم بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور اب مہمان گھوم پھر کر ایک دوسرے سے مل رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

مسٹر جان فارسٹر جو ریاست کا نیا انگریز وزیر داخلہ تھا۔ مہاراجہ کو مبارکباد دینے کے بعد صحن میں لگے ہوئے زربفتی شامیانے سے نکل کر ایک جاگیردار اور مسٹر جوشی سے باتیں کرنے لگا۔ وزیر داخلہ کو دیکھ کر انسپکٹر جنرل پولیس اور چند اور معززین اکھٹے ہو گئے۔ فارسٹر باتیں تو ان لوگوں

سے کر رہا تھا لیکن ان کے کان اس کھوج میں تھے کہ عفت اور عصمت کے تذکرے کس کس طرف ہو رہے ہیں اتنے میں اسے ڈرائنگ روم پر ایک زنانی آواز جوش میں بھری سنائی دی۔

"جس دیس میں اس کی بیٹیوں کی لاج محفوظ نہ ہو وہ مٹ جائے تو اچھا ہے۔"

پھر ایک مردانی آواز سنائی دی۔

"اتنا مبالغہ نہیں کرتے مالتی!"

مردانی آواز میں ایک التجا بھی تھی کہ ایسی باتیں کم سے کم یہاں تو نہ کرو۔

مالتی نے جواب دیا۔

"میں اتنا جانتی ہوں چاچا جی کہ ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔"

شاید کسی نے چپکے سے کہا کہ مسٹر فارسٹر پاس ہی کھڑے ہیں۔ مالتی نے جھک کر جواب دیا۔

"جس کا جی چاہے سن لے۔ میں سچ بات کہنے سے نہیں رک سکتی۔"

مسٹر فارسٹر ہندوستانی اچھی طرح سمجھ لیتے تھے۔ یہ سب باتیں سمجھ گئے۔ اور جوشی سے کہنے لگے۔

"آج کل عفت و عصمت کی باتیں بہت ہو رہی ہیں۔"

"کچھ نہ پوچھئے۔ ہر طرف اسی کا چرچا ہے۔"

فارسٹر کے لہجے میں تلخ غصہ موجود تھا۔ جو دبا دبا جانے پر بھی

جھلک آیا تھا۔ اب تو فارسٹر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب بھی عصمت کا تذکرہ سنتا تھا تو یہ محسوس کرتا تھا کہ سوامی کا من برت بھیس بدل کر مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔ ایسے حملے برداشت کرنے کرتے وہ اپنے سینے میں ایک وڑا تناہیٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

دوسری جنگ عالمگیر جاری تھی۔ اور ہندوستان میں رنگروٹ بھرتی کرکے چند ہفتوں کی تربیت دے کر محاذ پر بھیجے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں ایک فوجی ماہر نے یہ دریافت کیا کہ ریاست منی پور کے پہاڑ اور جنگل ایک خاص قسم کی جنگی تربیت کے لئے بہت موزوں ہیں۔ حکومت ہند نے مہاراجہ سے ٹیلی فون پر رسمی اجازت لی اور چند ہفتوں کے اندر اندر ضروری انتظامات کرکے وہاں تربیتی کیمپ کھول دیا گیا۔

تربیتی کیمپ اپنے ساتھ مسٹر فارسٹر کو بھی بحیثیت ریاست کے وزیر داخلہ کے لے آیا۔ مسٹر فارسٹر کو انگلستان سے آئے صرف پانچ سال گذرے تھے۔ لیکن اس نے اپنے کو اس تھوڑے سے عرصہ میں بہت کامیاب سویلین ثابت کر دکھایا تھا۔ اس نے ۱۹۴۲ء کے ہنگاموں کو فرو کرنے میں ایسی ہوشیاری دکھائی تھی کہ حکومت ہند اس کی انتظامی قابلیت کی قائل ہو گئی تھی اور اس کا خیال فارسٹر جیسے ہندوستانیوں کے مزاج داں انگریز ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ اس لئے حکومت کو بھروسہ تھا کہ مسٹر فارسٹر ریاست میں کوئی بات ایسی نہ ہونے دے گا جس سے کیمپ کے کاموں میں رکاوٹ پڑے۔

منی پور کی جس وادی میں کیمپ کھولا گیا تھا اس سے دو دو

تین تین میل کے فاصلے پر تین چار گاؤں واقع تھے۔ کیمپ کے کھلنے کے چند ہی روز کے بعد مسٹر فارسٹر کو معلوم ہوا کہ راتوں کو فوجی ان گاؤوں میں اچانک گھس جاتے ہیں اور وہاں کی عورتوں کو اٹھا لے جاتے ہیں۔ مسٹر فارسٹر نے یہ شکایت ہیڈ کوارٹر کو بھیجدی۔ تیسرے دن وہاں سے رسمی جواب آ گیا کہ "ضروری کارروائی کی جائے گی"۔

اس واقعہ سے دو مہینے بعد دس پندرہ فوجیوں نے گاؤں پر چھاپہ مارا اور وہاں سے چند عورتوں کو اٹھا لے گئے۔ صبح یہ عورتیں بہت بری حالت میں جنگل میں پڑی ہوئی ملیں۔ ان بیچاریوں کو ان کے عزیز اٹھا لائے۔ اسی دن شام کو ان میں سے ایک عورت نے جس کا نام سیتا تھا۔ موقع پا کر غیرت کے مارے خودکشی کر لی۔ اس خودکشی سے گاؤں والے بہت متاثر ہوئے۔ اور انہوں نے ریاست کے اعلیٰ افسروں کے سامنے رو رو کر فریاد کی۔ جواب میں ان سے کہہ دیا گیا کہ وزیر داخلہ نے فوجی ہیڈ کوارٹر کو لکھا ہے کہ ایسی حرکتوں کا سدباب کیا جائے اور ہیڈ کوارٹر نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ وعدہ جلد پورا ہوگا۔ یہ سن کر گاؤں والے واپس چلے گئے اور بظاہر بات ختم ہو گئی۔

لیکن دو ہفتوں کے گزر جانے کے بعد ایک سوامی نے درخواست دی کہ مجرم فوجیوں پر جلد سے جلد مقدمہ چلایا جائے۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے مسٹر فارسٹر سے ملاقات کی خواہش کی۔ فارسٹر نے سوچا کہ وہ فوجی جنہوں نے ایسی حرکت کی تھی اپنے دستے کے ساتھ ریاست سے جا چکے ہیں اور اب تک وہ برما یا افریقہ یا یورپ کے محاذ پر بھیجے جا چکے ہوں گے۔ ایک معمولی سے سوامی کی ہٹ پوری کرنے کے لئے یہ تو ہونے

سے رہا کہ محاذ پر لڑتی ہوئی ایک پوری فوج کو بلا لیا جائے۔ اور اس طرح لاکھوں روپیہ کا خرچ اور فوجیوں کی عام بددلی مول لی جائے۔ فوجیوں کی بددلی اور ایسے زمانے میں جب کہ ان میں جنگ سے اکتاہٹ پھیل رہی تھی اور ان کی دلدہی کی حد سے زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔

ظاہر ہے کہ یہ انہونی بات تھی۔ فارسٹر نے یہ سوچ کر سوامی سے ملنے سے انکار کر دیا۔

دوسرے دن انسپکٹر جنرل نے سوامی جی کا ایک خط فارسٹر کو دکھایا! جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اگر دو دن کے اندر اعلان نہ کر دیا گیا کہ مجرموں پر مقدمہ چلایا جائے گا تو میں مرن برت رکھوں گا۔

یہ خط پڑھ کر مسٹر فارسٹر نے کہا:۔

"کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح مجھے بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مسٹر گاندھی نے ابھی جو اکیس دن کا برت رکھا تھا اس کے پیچھے ایک طاقت تھی کیونکہ ہندوستان کے کروڑوں باشندے انہیں مہاتما سمجھتے ہیں اور پوجتے ہیں۔ لیکن ایک ادنیٰ سوامی جسے اس ریاست ہی کے بہت تھوڑے سے لوگ جانتے ہوں وہ کچھ جتن کرے یا بھوکا رہے۔ زندہ رہے یا مر جائے۔ یہاں رہے یا منہ کالا کر کے کہیں نکل جائے۔ یا پہاڑ سے گر کر خودکشی کرے۔ پبلک پر اس کی ان بچی باتوں کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور حکومت اس سے کیوں دبے گی؟ سوامی یا تو سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یا پاگل ہے۔"

سوامی نے فارسٹر سے عورت کی لاج کے نام پر اپیل کی تھی اور اسی کی رکھوالی کے لیے وہ جان دینا چاہتا تھا۔

فارسٹر کہنے لگا۔ "عورت کی لاج!! جس دنیا میں ہر طرف آوارگی اور بدچلنی ہو۔ جہاں پاک دامنی نام ہو صرف نادرستی رسی اور سماج کے خوف کا۔ جہاں پاک باز مرد ایسے موقعوں پر جہاں بدنامی کا اندیشہ نہ ہو کبھی نہ چوکتا ہو۔ جہاں وفادار بیویاں تصور کی خلوتوں میں آزادی سے غیر مردوں سے ہم بستر ہو جاتی ہوں وہاں ایک ادنی لڑکی کی عصمت کے لئے اتنا اودھم!! یہ حرکت صرف احمقانہ اور بے نتیجہ آدرش پرستی ہے ـــــ سبتا نے خودکشی کر لی۔ حماقت کی۔ اگر وہ جیتی تو اس کا مستقبل اس کے ماضی سے بڑا نو نہ رہتا۔ ایک مرد اسے مسترد کر دیتا تو دوسرا پسند کر لیتا۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے۔

سوامی نے جیسا کہا تھا۔ ویسا ہی کیا۔ یعنی دو دن کے بعد مرن برت شروع کر دیا۔ فارسٹر نے جنگ کے زمانے کے اختیارات سے کام لے کر اخبارات کو برت کی خبریں چھاپنے کی ممانعت کر دی۔ ہر قسم کے جلسے اور جلوس خلاف قانون قرار دے دیئے۔ اور پھر اس واقعہ کو اس نے اپنے ذہن سے نکال پھینکا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ دوسرا ہفتہ گذر گیا۔ تیسرا ہفتہ گذر رہا تھا کہ ایک دم سے سبتا ہر ہر گھر میں عفت و عصمت کی دیوی بن کر نمودار ہو گئی۔ شاعروں نے اس کی شان میں نظمیں اور کویوں نے کوتیائیں کہیں۔ گویوں نے وہ گائیں اور اخباروں میں چھپیں۔ اخبارات میں عصمت پر مضامین نکلنے لگے۔ کسی مصور نے سبتا کی ایک فرضی تصویر

بنادی۔ جو ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگی۔ ہر ہر گھر۔ ہر ہر صحبت اور ہر ہر آفس میں یہ بحثیں ہونے لگیں کہ عصمت بہت ضروری چیز ہے اس کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا ہے۔ یہ نہ رہے گی تو سماج کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر شوہر بیویوں پہ بھروسہ کیسے کریں گے؟ کنواری لڑکیوں کے جو بچے ہوں گے ان کو پالے گا کون۔ اسی طرح کے درجنوں سوالات اٹھ کھڑے ہوئے جو گھوم پھر کر کسی نہ کسی راستہ سے جواب کی تلاش میں فارسٹر کے پاس پہنچتے تھے۔ وہ دل ہی دل میں ہندوستانیوں کی آدرش پرستی پر ہنستا اور ان سوالوں کے جواب میں موقع اور محل کا لحاظ کر کے کوئی چبھتا ہوا فقرہ کس دیتا تھا لیکن جب ان سوالوں کا اور عصمت کی عظمت پر بحثوں کا سلسلہ بہت بڑھ گیا تو فارسٹر کو کچھ فکر ہونے لگی کہ سوامی کے برت کے اس خفیہ حملے کو کیسے روکا جائے۔

چوتھے ہفتہ فارسٹر کو ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے ہر خاموش ہونٹ اور ہر چار ہونے والی آنکھیں اسی مسئلہ پر اس سے بحث کرتی ہیں۔ اور اس کے بارے میں ان گنت سوالوں کو اس سے پوچھتی ہیں۔ رفتہ رفتہ فارسٹر کی یہ حالت ہو گئی کہ اگر کوئی شخص دانستہ یا نا دانستہ عصمت کے مسئلہ کا حوالہ دے دیتا تو فارسٹر اندر ہی اندر کھول جاتا۔ اور غصے کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔

آج سوامی کے برت کو پانچ ہفتے گذر چکے تھے۔

مسٹر جان فارسٹر کا ریمارک۔ اور مسٹر جوشی کا جواب سن کر انسپکٹر جنرل پولیس نے کہا۔

"ہر جگہ یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ بازار۔ کلب، اسکول، کالج۔ بار۔ غرضکہ یہی مسئلہ ہر جگہ زیر غور ہے۔ شادیوں اور غمیوں میں بھی یہی باتیں ہو رہی ہیں۔"

فارسٹر۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کے سب کام رکے ہوئے ہیں اور جب تک عصمت کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا ہے زندگی کی گاڑی ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔"

فارسٹر کے اس فقرے پر ایک بانمیز قہقہہ لگا جس میں انسپکٹر جنرل پولیس کے علاوہ ریاست کے دوسرے وزیروں نے بھی حصہ لیا۔

فارسٹر (ذرا اونچی آواز میں) "میں جانتا ہوں کہ عصمت بہت بڑی چیز ہے لیکن بعض چیزیں اہمیت میں اس سے بدرجہا زائد ہیں۔ آج مہذب ملکوں میں دفاع پر ہر ہر چیز قربان کی جا رہی ہے۔"

انگریز مہمانوں کے لئے ایک میز الگ لگا دی گئی تھی جس پر شرابیں اور سور کے گوشت کے کباب اور انگریزوں کی پسند کی دوسری چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ فارسٹر گفتگو ختم کر کے ادھر گیا۔ اور وسکی کا ایک بڑا سا پگ لے کر اس نے ایک گھونٹ پیا۔ اتنے میں پاس سے آواز آئی۔

"مسٹر فارسٹ! کیا آپ سوامی کے برت کا مقابلہ اسی طرح کرتے رہیں گے۔ خواہ وہ مر جائے۔"

اس سوال کی پوچھنے والی مس لیمب تھی۔ جو ریاست کے ایک سابق انگریز دیوان مسٹر جیمس لیمب کی اکلوتی بیٹی تھی۔

فارسٹر۔ "مس مس اگر کوئی شخص مرنا چاہتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔"

ہلیں۔ "جس طرح آپ برٹ کا اور اس کے پس منظر میں ہندوستانیوں کے جو دقیانوسی اقدار ہیں ان کا مقابلہ کر رہے ہیں میں اس کی تعریف نہیں کر سکتی ہوں۔ ونڈرفل"۔

فارسٹر۔ "تھینک یو"۔

ہلیں۔ "آپ نے مجھے ایک بہت بڑی چیز بتادی۔ وہ یہ کہ مغرب کی ٹھوس حقیقت پسندی اور بنیادی سوجھ بوجھ کیسی ہوتی ہیں اور ہندوستان کے دقیانوسی اقدار کا مقابلہ کس خوبصورتی سے کر سکتی ہیں اور ان کو اپنی جنگی نقل وحرکت سے کس طرح پاش پاش کر سکتی ہیں"۔

مس ہیں حسین کسی پہلو سے نہ تھی۔ بہت معمولی صورت تھی۔ اس کے بال تھوڑی سی لہروں کے ساتھ کندھوں پر ریشم کے لچھوں کی طرح جھول رہے تھے۔ آنکھوں میں ساکن تال کی نیلاہٹ تھی۔ ہونٹ نیلے پتلے تھے جو اس وقت جوش اور ضبط سے کانپ رہے تھے۔ گالوں پر بیماری کا سایہ تھا۔ چہرہ پر کچھ ایسا بھولاپن اور نا تجربہ کاری تھی کہ وہ باوجود ۲۵-۲۶ سال کی ہونے کے بیس سال کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

مس ہیں کا باپ پندرہ سال ریاست کا دیوان رہ کر مر گیا تھا مہاراجہ نے اس کی خدمات کے صلہ میں اس کے خاندان کو ایک جاگیر دے دی تھی۔ لیکن یہ شرط لگادی تھی کہ یہ جاگیر اس وقت تک خاندان کے پاس رہے گی جب تک وہ ریاست میں مستقل سکونت رکھے کچھ اس جائداد کی وجہ سے اور کچھ ہیں کی صحت کی مستقل خرابی کی وجہ سے یہ خاندان اسی ریاست میں بس گیا تھا۔

پھر ہیں نے کہا۔

"میں ممی سے ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ ممی مجھے ایک سپنا نظر آتا ہے، وہ یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی انگلستان سے کوئی انگریز ایسا ضرور آئے گا جو مجھے سچا انگریز بنا دے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میری پیدائش انگلستان کی ہے جی ہاں میں چار سال کی تھی جب پاپا کے ساتھ وہاں سے آئی تھی لیکن میری زندگی بیماری کے بستر پر گذری۔ پڑے پڑے میں سوچا کرتی تھی کہ مغرب کی وہ کونسی خصوصیتیں ہیں جن سے اس نے دنیا فتح کر لی ہے۔ لیکن میرا ملنا جلنا صرف ہندوستانیوں سے تھا۔ یوں تو وہ انگریزی بولتے تھے اور ماڈرن انگریز مصنفوں کی باتیں کرتے تھے۔ لیکن تھے سب کے سب دقیانوسی اقدار کے پجاری۔ کچھ ان کے اثرات، کچھ گاندھی کی شہرت اور اس کی تحریریں۔ ان چیزوں نے مجھے فتح سا کر لیا۔ لیکن اندر ہی اندر میں اس ذہنی غلامی سے گھبراتی تھی۔ اور اس جال کو توڑنے کے لئے اپنی قوم کی طرف دیکھتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی انگریز مجھے اس دلدل سے ضرور نکال لے گا۔ جب میں نے دیکھا کہ آپ سوامی کے برت کی کوئی پروا نہیں کرتے ہیں اور اس کے خیالات اور عمل کو خاطر میں بھی نہیں لاتے ہیں اور اپنے مغربی اقدار پر پختہ عقیدہ رکھتے ہیں تو میں نے اپنے سے کہا۔ لے بیس، وہ آگیا۔"

فارسٹر کو ایک دم سے یہ خیال آیا کہ بیس دو ہفتوں سے انگریزی کلب میں میرے گرد چکر کاٹا کرتی ہے۔

فارسٹر۔ "مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میرے خیالات سے آپ کو کچھ فائدہ پہنچا۔"

بیس۔ "فائدہ سا فائدہ!!۔۔۔ ہاں ایک میری تمنا اور ہے۔ وہ یہ کہ میں اپنی قوم کی کچھ خدمت کر سکوں۔ افسوس کہ میری طول طویل بیماری نے

میرے جسم کو کمزور بنا دیا ہے اور میری کوئی خاص تعلیم بھی نہیں ہو سکی ہے اس لئے نہ میں جسمانی خدمت کر سکتی ہوں اور نہ دماغی۔"
فارسٹر۔ "گھبرائیے نہیں آپ کو بھی کبھی نہ کبھی۔ کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جائے گا۔"

بیس کی باتیں سنتے ہی فارسٹر کی خود اعتمادی ایک دم سے دگنی بلکہ چوگنی ہو گئی۔ وہ یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے خیالات اتنے بلند ہیں کہ وہ ایک عقلمند لڑکی کے۔ برسوں کے خوابوں کی تعبیر بن گئے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ میں ایک بڑے مشن کو پورا کر رہا ہوں۔ جو مغربی تہذیب نے مجھے سونپا ہے۔ یعنی ہندوستان کو احمقانہ آدرش پرستی کی جگہ مغربی حقیقت پسندی عطا کرنا۔

(۳)

سوامی کچھ نہ کچھ چھپ کر ضرور کھا لیتا ہوگا۔ اس لئے وہ مرے گا نہیں۔ سوامی اپنے برت کو مجھ پر کارگر نہ ہوتا ہوا دیکھ کر ضرور توڑے گا وہ نہ توڑے گا تو اس کے بھگت اصرار کر کے تڑوا دیں گے۔

یہ تھیں فارسٹر کی قیاس آرائیاں جو سب کی سب غلط ثابت ہوئیں اور سوامی دو مہینے پورے کرنے سے پہلے ہی چل بسا۔

سوامی کے مرنے سے پہلے ہی شہر کی حالت بگڑ چکی تھی۔ چار مقامی اخباروں میں سے دو کو باغیانہ تحریروں کے الزام میں بند کرنا اور دو کو بھاری قیمت پر خریدنا پڑا تھا۔ ایک شاعر کو اس جرم میں کہ اس نے عصمت کی خوبیوں پر ایک نظم ایک صحبت میں پڑھ دی تھی دو سال قید بامشقت کی سزا دینی پڑی تھی۔ شہر کے کچھ نوجوانوں نے کئی بار جلسہ

کرنے کی کوششیں کی تھیں اور ان جلسوں کو لاٹھی چارج سے منتشر کرنا پڑا تھا۔ ایک بار تو ان نوجوانوں نے جوش میں آکر سیناڈے منا کر خلاف قانون جلوس نکال لیا تھا۔ جسے منتشر کرنے کے لئے ایسا سخت لاٹھی چارج کرنا پڑا کہ چھ آدمی مر گئے۔ اور سو سے اوپر زخمی اسپتال پہنچائے گئے آخری ہفتے کے اندر اس چھوٹے سے شہر میں بتیس آدمیوں کو گرفتار کر کے بلا مقدمہ چلائے جیل میں ڈال دینا پڑا تھا۔

فارسٹر سوامی کے برت کے چوتھے ہفتے کے بعد سے ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ عصمت اس کی صف میں انتشار مچا رہی ہے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی اپنی صف کے لوگوں کے جذبات بھی سوامی کی صف میں شامل ہو رہے ہیں۔ اور اس کی حکومت صرف ان کے ہاتھ پاؤں پر رہ گئی ہے۔ سیناڈے کے موقع پر عام طور سے شہریوں نے دن بھر کا برت رکھا تھا اس دن رات کو فارسٹر کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ بڑے بڑے سرکاری افسروں کی بیویوں اور بیٹیوں نے بھی اس دن خرابی صحت کی بنا پر دن بھر فاقہ کیا تھا۔

فارسٹر تو اوپر سے ویسا ہی مضبوط تھا جیسا اول دن تھا لیکن اس کے اندر ایک طوفان امنڈ رہا تھا۔ جس کا زور روز بروز بڑھتا ہی جاتا تھا۔ جب وہ لوگوں کو اس جرم میں سزا دیتا تھا کہ وہ عصمت کی ضرورت سے زیادہ حمایت کرنے کی وجہ سے بغاوت کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ یا نہتے مجمع پر لاٹھی چارج کراتا تھا تو اسے اپنے آپ کو اس سخت کام کے لئے پہلے سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ اور کام ختم کرنے کے بعد دیر تک اپنے آپ سے بحث کرنا پڑتی تھی کہ اس نے جو کچھ کیا ہے

ٹھیک کیا ہے اور جب یہ بحث بہت طول پکڑ جاتی تو اسے وھسکی کی بوتل کی آڑ میں چھپ کر اس بحث سے جان چھپانا پڑتی تھی۔ دن بدن یہ تیاری۔ یہ بحث اور یہ آڑ لے کر چھپنا یہ سب کام مشکل سے مشکل تر ہوتے جاتے تھے۔

ایک دن فارسٹر کو یہ رپورٹ ملی کہ ایک ادنیٰ سی رنڈی نے یہ کہہ کر سیتا فنڈ میں چندہ دیا ہے کہ اگرچہ میں خود عصمت کی دوکاندار ہوں لیکن خوب جانتی ہوں کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے اور اس کی رکشا کتنی ضروری ہے۔ یہ رپورٹ پاکر فارسٹر اپنے آپ سے پوچھنے لگا کہ کیا واقعی وہ چیز جس کا نام عصمت ہے ایسی ہی ہے کہ لوگ اس کے اتنے دیوانے ہوجائیں ؟ لیکن اس سوال نے اس کے دماغ کو خیالات کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھا دیا جس کا کوئی سرا نہ ملا۔

(۳)

ایک رات فارسٹر نے پولیس کے دو افسروں کو سادے کپڑوں میں ساتھ لیا۔ اور معمولی شہریوں کی طرح سوامی سے ملنے پہنچ گیا۔ وہاں وہ خود کچھ نہیں بولا۔ پولیس کے افسر باتیں کرتے رہے۔ سوامی نے اپنے برت کا مقصد سمجھایا اور پھر کہنے لگا۔

"یہ سمجھنا کہ یہ برت کسی شخص کی مخالفت میں ہے بہت سخت غلطی ہے۔ عصمت کی رکشا کرنا حکومت پر فرض ہے اور وہ اس فرض سے اس وقت پہلو تہی کر سکتی ہے جب حق اور انصاف کا اثر سماج میں کم ہو جائے۔ میں اپنے برت سے حق اور انصاف کو جگانا چاہتا ہوں۔"

پھر سوامی کہنے لگا: "جو لوگ میری مخالفت کرتے ہیں وہ بھی عورت کی لاج کی قیمت جانتے ہیں پھر میں ناحق پر کیسے ہو سکتا ہوں۔"
فارسٹر نے سوامی کے الفاظ سے زیادہ اس کے دل کو محسوس کیا وہاں واقعی اس کے خلاف یا کسی اور کے خلاف ذرا بھی نفرت نہ تھی۔

اس ملاقات نے سوامی کو اور کمزور کر دیا۔ جو شخص تم سے نفرت کرتا ہو یا تم سے ڈرتا ہو یا تم کو غصہ دلاتا ہو اس کے سینہ پر نشانہ باندھنا اور گولی مارنا آسان ہے۔ لیکن جو شخص نہ نفرت کرتا ہو۔ نہ ڈرتا ہو۔ نہ غصہ دلاتا ہو بلکہ الٹا اپنے طریقہ سے بھلا چاہتا ہو اس پر نشانہ باندھنا یا گولی مارنا آسان کام نہیں۔ مشکل اور بہت مشکل ہے۔

سوامی مر گیا اور مر کر ایک سخت مسئلہ چھوڑ گیا۔ وہ یہ کہ سب شہر والے مل کر اس کی ارتھی اٹھانا چاہتے ہیں۔ اس بات کی ان کو اجازت دی جائے یا نہ دی جائے۔
سوامی کے مرنے سے عصمت کا معاملہ اور سنگین ہو گیا۔ ریاست کے عوام کی حالت یہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ ندیدی بلی کی طرح ان کی عورتوں کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے اس لئے عوام قدرتی طور پر اپنی عورتوں کی عصمت کی حفاظت کے لئے سربکف ہیں۔ غم و غصہ کا ایک آتش فشاں سلگ رہا تھا۔ اور کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے پیٹ میں کتنا لاوا بھرا ہے۔
فارسٹر مذبذب تھا کہ کیا کروں عوام کو شروع ہی سے دباؤں

یا پہلے ڈھیل دے دوں پھر دباؤں۔ لیکن انگریزی کلب میں ایک بات ایسی ہو گئی جس نے فارسٹر کو سہارا دے دیا۔ اور اس سہارے سے اس نے اپنا تذبذب ختم کر دیا۔ کلب میں ریاست بھر کے انگریز موجود تھے اور سب کے سب جلوس کے نام سے بہت خوفزدہ تھے۔ سب ایک رائے کے تھے وہ یہ کہ ہم کو گاندھی والوں کے عدم تشدد پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ کیا معلوم وہ کس وقت تشدد پر اتر آئیں۔

ایک میم نے کہا۔

"فرض کرو جس وقت جلوس نکل رہا ہو اس وقت گاندھی والوں کا افسر اپنے آدمیوں کو بزن کا حکم دے دے اور ایک دم لاکھ دو لاکھ غنڈے ہم پر ٹوٹ پڑیں تب مسٹر فارسٹر تم کیا کرو گے؟"

کپتان ڈرجٹ جو اپنی چھٹیاں گذارنے حال ہی میں اپنے ایک دوست کے پاس منی پور آیا تھا کہنے لگا۔

"مسٹر فارسٹر! آپ کو ہم لوگوں کی جانوں پر تجربہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

مِس لیمب نے تال میں نظر آنے والے آسمان کے رنگ کی آنکھوں سے مسٹر فارسٹر کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آپ متذبذب کیوں ہیں؟ کیا ہندوستانیوں کی دقیانوسی اقدار نے آپ کو بھی توڑ لیا؟"

فارسٹر کا انگریزی غرور عود کر آیا۔

"میں ٹوٹنے کا نہیں لیمب!"

فارسٹر نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جلوس نہیں نکلے گا۔ صرف دس آدمیوں کو ارتھی کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے گی۔

(۴)

جلوس کی اجازت نہیں دی گئی۔ لیکن شہر والوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اور خلاف قانون دس ہزار آدمی ارتھی لے کر اس نیت سے روانہ ہوئے کہ شہر کے خاص بازار سے ہو کر شمشان جائیں گے فارسٹر نے خلاف قانون جلوس کو منتشر کرنے کا پہلے سے انتظام کر لیا تھا۔ بازار کے دوسرے سرے پر مسلح پولیس کھڑی کر دی تھی اور خود بھی موقع پر موجود تھا۔ بازار سے گذر کر جلوس جب نکڑ پر پہنچا تو پولیس نے اس کا راستہ روک لیا۔

ارتھی کے آگے سوامی کے کچھ چیلے تھے۔ ان کے بعد ریاست کے سیاسی کارکن تھے جن کے ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا تھا۔۔۔۔ اس کے پیچھے آدمیوں کا سمندر تھا۔ جس میں ایک طرف عورتوں اور بچوں کا غول بھی تھا۔ لوگوں کے ہاتھ میں ایک چھڑی تک نہ تھی۔ پولیس نے لاوڈ اسپیکر سے اعلان کیا کہ اگر مجمع نکڑ سے آگے بڑھا تو اس پر فائرنگ کر دی جائے گی۔ لیکن مجمع نے اس اعلان کی کوئی پروا نہیں کی اور آگے بڑھتا رہا۔ جیسے ہی وہ بازار کی حد سے نکلا فارسٹر نے حکم دیا "فائر"

ٹھن۔ ٹھن ٹھن ٹھن دو راؤنڈ چلے۔ آگے کی قطار ڈھیر ہو گئی ارتھی گر پڑی اور لوگ بدحواسی سے بھاگنے لگے۔ کچھ دوکانوں پر چڑھ گئے۔ اور کچھ ایسے بھاگے کہ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جب مجمع

منتشر ہو گیا تو فارسٹر نے حکم دیا کہ ارتھی پر قبضہ کر لو۔ پولیس آگے بڑھی ایکا ایکی ایک نوجوان پاگلوں کی طرح بھیڑ سے نکل آیا۔ اور زمین پر پڑے ہوئے جھنڈے کو اٹھا کر اس نے نعرہ لگایا۔

"انقلاب زندہ باد" "انقلاب زندہ باد"

فارسٹر نے پستول سے اس کے ہاتھ پر فائر کیا۔ جھنڈا گر پڑا اور ساتھ ہی ساتھ وہ نوجوان بھی۔ لیکن ایک لوٹ مار کر وہ پھر اٹھا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے جھنڈا اٹھا کر نعرہ لگایا۔

"انقلاب زندہ باد"

مجمع نے جواب میں زندہ باد کا نعرہ بلند کیا۔ اور لوگ ارتھی کی طرف بڑھنے لگے۔

فارسٹر نے دوسری گولی چلائی۔ اور نوجوان مع جھنڈے کے گر پڑا۔ فارسٹر سمجھا کہ وہ مر گیا ــــ لیکن ایک منٹ کے بعد اس نے پھر کروٹ بدلی۔ اور پاس پڑے ہوئے جھنڈے کو دانتوں میں دبا کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے لگا۔ اور اٹھتے اٹھتے نعرہ لگایا۔

"انقلاب ــــ"

فارسٹر کو اس کی ضد پر غصہ آگیا۔ اور اس نے پورا پستول اس زخمی پر خالی کر دیا۔ نوجوان جہاں تھا وہیں خون میں نہا کر لوتھڑے کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اس بات پر مجمع چھٹنے کی بجائے اکھٹا ہو کر نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا

"انقلاب زندہ باد"

"سوامی جی زندہ باد"

"عصمت و عفت زندہ باد"

فارسٹر نے پھر فائرنگ کا حکم دیا۔ اب کی چھ راؤنڈ چلے۔ تب جاکر مجمع منتشر ہوا۔ بھاگنے والے نوجوان کی لاش تو اٹھالے گئے۔ لیکن سوامی کی ارتھی تک نہ پہنچ سکے۔ پولیس نے ارتھی پر قبضہ کر لیا۔ اور شمشان لے جاکر پھونک دیا۔

(۵)

فارسٹر کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ لیکن وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی شریکِ زندگی وہسکی تھی جو جلوت و خلوت خوشی و غم ہر موقع پر وفاداری سے اس کا ساتھ دیتی تھی۔ فارسٹر جب سوامی کی لاش پھنکوا کر واپس آیا تو اس نے بہت بدحواسی سے اپنی شریکِ زندگی کو یاد کیا۔ لیکن آج وہ کسی طرح بھی فارسٹر کے دل کی پیاس نہ بجھا سکی۔ اس کے سینہ میں ایک خنجر پیوست تھا۔ جو کسی طرح نکالے نہیں نکلتا تھا۔ دانتوں میں جھنڈا دبانے والا نوجوان اور برت رکھ کر مر جانے والا سوامی اور سبیتا۔ یہ سب گھسے ہوئے اس کے دل و جگر کا قیمہ بنا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرے سینے تک جسے میں نے کئی زرہوں سے چھپا رکھا تھا ان خنجروں نے کیسے راستہ پا لیا۔ اس نازک وقت میں اس خیال سے بھی کچھ سہارا نہیں مل رہا تھا کہ میں کمزور انگریزوں کا محافظ ہوں کیوں نہتے مجمع کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس بات پر یقین کرنا کہ یہ کبھی لوٹ مار بھی کر سکتا تھا۔ محال ہو چکا تھا۔

فارسٹر سوچنے لگا کہ کاش کوئی آواز ہوتی۔ جو پیار و پریم میں ڈوبی

ہوئی میرے دل پر ملائم ملائم ہاتھ پھیرتی۔ اور کہتی "ڈارلنگ جان" تم نے جو کچھ کیا ہے وہ درست ہے۔ تم غلطی پر نہیں ہو۔ غلطی پر تھا وہ سوامی جو اپنی حماقت میں مر گیا۔ اور غلطی پر تھا وہ نوجوان جس نے پاگل پن میں اپنی جان دے دی ــــ" لیکن ایسی آواز کہاں ہے؟

ایک دم سے دبلی پتلی مس بیمب لیمب فارسٹر کے دل میں رونما ہو گئی، فارسٹر کی نگاہوں سے پردے سے اٹھنے لگے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ڈیڑھ مہینہ سے جب سے کہ میں برٹ سے لڑ رہا ہوں وہ میرے لئے رجز بھی رہی ہے اور لوری بھی۔ جب مجھے جنگ پر جانا ہوتا تھا تو وہ خیالوں کے تاروں پر رقص کرتی ہوئی آئی ہے۔ اس نے مجھے گدگدا گدگدا کر جگایا ہے۔ اور اپنی پھیروں سے میری ہمت بندھائی ہے۔ پھر جب میں تھکا ہارا واپس آیا ہوں۔ تو وہ مسکراتی ہوئی تصور میں آئی ہے اور اس نے خود اعتمادی کے پھائے لگا کر میرے زخم مندمل کئے ہیں۔ فارسٹر نے پلٹ کر اپنے سے کہا۔ جان تم بے وقوف ہو جو ابھی تک تم نے یہ محسوس نہیں کیا کہ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ وہ لڑکی تمہارے لئے بہت ضروری ہے۔ اگر تم انجن ہو تو وہ بھاپ ہے۔ تم ہوائی جہاز ہو تو وہ پٹرول ہے۔ تم کو اسے اپنا بنا لینا چاہیئے۔

فارسٹر میس کی تلاش میں کلب گیا۔ لیکن وہاں وہ نہیں ملی۔ حالانکہ وہ بہت پابندی سے آیا کرتی تھی۔ فارسٹر کو اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گئی ہے۔ لیکن اسے ایک اندیشہ اور

بھی ہوا جس سے وہ بہت پریشان ہو گیا۔ وہ یہ کہ کپتان ڈرجٹ اس کے پیچھے لگا رہتا تھا اور وہ اس خطرناک قسم کے عورت کے شکاریوں میں سے تھا جو کسی نہ کسی چال سے عورت کو اپنے اوپر ترس دلا کر اس کے مادرانہ جذبے کو کھولا دیتے ہیں اور پھر اس حالت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ فارسٹر نے طے کیا کہ مجھے فوراً ہیس کے یہاں جانا چاہیئے۔

فارسٹر ایسا شخص تھا جس کے سینے میں طاقت اور اختیارات حاصل کرنے کی امنگوں کا طوفان امڈا کرتا تھا۔ اور جو اپنی منزل کے لئے بلا جھجک خون کا دریا بھی پار کر سکتا تھا۔ لیکن آج کل یہ امنگیں ایسے نامعلوم بھاری بوجھ کے نیچے دبی ہوئی تھیں جن کے نیچے سے ان کے رجزیہ گیت آہ بن کر نکلتے تھے اس لئے اس کو خارجی سہارے کی ضرورت تھی۔ اور فوری ضرورت۔

فارسٹ بہت بے تابی سے ہیس کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اس کا گھر ایسی پہاڑی پر تھا جہاں کافی دور تک پیدل جانا پڑتا تھا۔ یہ راستہ کاٹنا اس کے لئے دوبھر ہو گیا۔

(۶)

ہیس نے دور سے فارسٹر کو آتے دیکھ لیا۔ اور وہ خوشی سے چلا کر اس کی طرف دوڑی۔

"مسٹر فارسٹر — میں اس وقت آپ سے ملنے کے لئے کتنی بے چین تھی!! لیکن اس بات کا تو سان گمان بھی نہ تھا۔ کہ میں اتنی خوش نصیب ہوں۔ کہ آپ یہاں آجائیں گے۔ آئیے مسٹر فارسٹر۔"

مسز کوپیس نے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا۔

"میں آپ کو ایک خبر سنانے کے لئے بہت بےچین ہوں۔ یہ بات ایسی ہے جسے میں دنیا میں صرف آپ سے کہہ سکتی ہوں اور صرف آپ ہی اس کی عظمت محسوس کر سکتے ہیں کیونکہ آپ میرے جگری دوست بھی ہیں اور گرو بھی، ساتھ ہی ساتھ مغربی اقدار کی آپ زندہ تصویر بھی ہیں۔ وہ خبر یہ ہے کہ آج مجھے اپنی مادرِ وطن کی ایک خدمت کرنے کا موقع مل ہی گیا جی ہاں مجھ بیمار لڑکی نے مادرِ وطن کی خدمت کی وہ یہ کہ میں نے ایک تھکے ماندے فوجی کو تازہ ہمت دے کر محاذ پر بھیج دیا۔ ایک پکی ماڈرن انگریز لڑکی کی طرح۔" فارسٹر کے سینے پر ایک نامعلوم گھونسہ لگا۔

فارسٹر۔ کیا مطلب ؟ میں نہیں سمجھا۔

ملیس (ہنس کر) آپ خیال بھی نہیں کر سکتے کہ میں نے کیا کیا ہو گا۔ کپتان ڈریٹ کی چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں لیکن وہ لڑائی سے اتنا اکتایا ہوا تھا کہ کہتا تھا کہ میں محاذ پر جانے کے بجائے سامنے کے پہاڑوں میں بھاگ جاؤں گا اور وہاں مارا مارا پھروں گا۔ جب اس کی بھی سکت نہیں رہے گی تو اپنے کو کسی چوٹی پر سے گرا دوں گا۔ وہ کہتا تھا کہ مار ڈالنا وہ کاروبار ہے جس کے لئے انسانی دل کو ایک خاص قسم کے راشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ہے۔ چاہت۔ نرم و نازک نسوانی لمس۔ اور مجھے یہ ملا نہیں ہے، دو سال بیت گئے۔ اس کے بغیر۔ جب وہ یہ باتیں مجھ سے کیا کرتا تھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نہ ہوتی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

میں اس کی حالت دیکھ کر اپنے دل سے پوچھا کرتی تھی کہ ایک ماڈرن لڑکی کو جو ہندوستان کے دقیانوسی اقدار کی نہیں بلکہ یورپ کی حقیقت پسند اقدار کی یعنی ان اقدار کی جس کا مجسمۂ آہنی فارسٹر ہیں

بچارن ہے اسے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ کیوں نہ اس بھوکے ماندے سپاہی کو اس کا مطلوبہ راشن دے دے؟ آخر بہت غور و فکر کے بعد میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیئے تھا۔"

فارسٹر۔ (اپنی بے چینی کو بہت سخت کوشش سے چھپا کر) "کیا کیا؟"

ہیس۔ جس چیز کا وہ بھوکا تھا وہ اسے دے دی۔ ہم دونوں نے ایک وادی میں جا کر خوب دادِ عیش دی۔ اہا ہا ہا۔ مسٹر فارسٹر میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے ڈرجیٹ اس وقت ہوائی جہاز پر نہیں جا رہا ہے بلکہ میں اسے اپنے بازوؤں پر محاذ کی طرف لیئے جا رہی ہوں۔ اور جب وہ ہماری مادرِ وطن کے لئے دشمن سے لڑے گا اس وقت وہ اپنے بازوؤں سے نہیں بلکہ (اپنے ہاتھوں کو اونچا کر کے) ان کمزور ہاتھوں سے لڑے گا۔

فارسٹر۔ "کیا اس نے تم سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے؟"

ہیس۔ "شادی کا وعدہ کیا!!! اس کی بیوی لندن میں موجود ہے"۔

فارسٹر۔ "ہیس کیا تم اتنی ہی احمق ہو؟"

ہیس:۔ "کیا مطلب؟"

فارسٹر:۔ "تم نے اپنے کو ایک بدمعاش کی خواہشوں کا شکار بنا دیا۔ اور سمجھتی ہو کہ مادرِ وطن کی خدمت کی ـــــ کیا واقعی تم سے اتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے؟"

ہیس۔ اتنی بڑی غلطی!! جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سب واقعہ ہے۔ لیکن اس میں غلطی کیا کی میں نے؟ آدمی کا انتخاب غلط تھا یا

فعل غلط؟"

فارسٹر:۔ (جھنجھلا کر) کیا تم اتنی بھولی ہو پیس! تم میں سوجھ بوجھ کی اتنی کمی ہے کہ جو بات چھوٹی سے چھوٹی لڑکی سمجھ سکتی ہے تم وہ بھی نہیں سمجھ رہی ہو"!

پیس۔ میں سمجھی۔ تم کو میرے مستقبل کی فکر ہے۔ ممی کو اگر معلوم ہو جائے تو ان کو بھی یہی فکر ہوگی۔ لیکن مجھے کوئی فکر نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ہو سکا تو میں یورپ یا امریکہ چلی جاؤنگی اور اگر یہ ممکن نہ ہوا تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ میری سب سے بڑی تمنا تھی کہ میں غریب الدیار اپنے وطن کی کوئی خدمت کر سکوں سو وہ پوری ہو گئی۔ اب جو بھی ہو سب بھگت لوں گی"۔

فارسٹر:۔"یہ بتاؤ تم ورجیٹ کی محبت میں تو گرفتار نہیں ہو گئی تھیں یا ایسا تو نہیں ہوا کہ اس کے رونے کی وجہ سے تم بہت زیادہ پگھل گئی ہو۔"

پیس:۔ میں اتنی جذباتی تو نہیں ہوں شاید۔ اتنا تو تم محسوس کر ہی سکتے ہو"

فارسٹر۔"پھر کیا تم کو اس میں جنسی کشش نظر آئی؟"

پیس:۔" نظر تو آئی لیکن پہلے نہیں جب میں نے فیصلہ کر لیا اس کے بعد"

فارسٹر۔ تو سن لو تم عصمت باختہ عورت ہو"

یہ سن کر پیس پر بجلی گر پڑی۔ وہ چند سکنڈ خاموش رہی پھر اپنے کو قابو میں کر کے کہنے لگی۔

ہیبس "عصمت باختہ!! تم اس لڑکی کو عصمت باختہ کہتے ہو جس نے تمہارے خیالات پر عمل کیا۔"

فارسٹر:- "خیالات، خیالات، خیالات، خیالات کا کیا۔ آدمی سینکڑوں باتیں روز کہا کرتا ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آنکھیں بند کر کے ان پر عمل کیا جائے؟"

ہیبس۔ لیکن تم تو کہتے تھے کہ تمہارے خیالات ہندوستانی آدرشوں کی طرح ناقابلِ عمل نہیں ہیں بلکہ وہ روزمرہ کی زندگی کی چیزیں ہیں ــــ لیکن میں سمجھ گئی۔ میں نے واقعی دھوکہ کھایا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے ورجیٹ کے ہاتھ سے دھوکہ کھایا ــ نہیں نہیں میں نے تو تم سے دھوکہ کھایا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کسی فوری جذبے سے کیا؟ میں اس قربانی کے لئے اپنے کو ڈرجیٹ کے آنے کے ایک مہینہ پہلے سے، جب سے کہ میں نے اپنے کو تمہارا چیلا بنایا ہے۔ تیاری کر رہی تھی۔ تاکہ موقع پڑنے پر میں اس طرح کی خدمت کر سکوں۔ جب میرا دل اس کے خلاف فریاد کرتا تھا تو میں اس کو سمجھاتی تھی کہ مجھ پر آورش پرستی کا سایہ ہے۔ اس لئے تو ایسی باتیں کرتا ہے۔ عصمت کے حامیوں کے خلاف تمہاری جنگ نے میری ہمت بندھائی۔ اور میں نے اپنے دل کا گلا گھونٹ گھونٹ کر اسے خاموش کیا ــ لیکن افسوس ــــ راز اب کھلا۔ میں نے جس آواز کو مار ڈالا وہی سچی تھی۔ میں نے اپنے کو پوری طرح برباد کر ڈالا ــــ لے میں یہ ہے تعبیر تیرے

اونچے خوابوں کی ــــ"

ہیس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فارسٹر غم و غصہ اور کوفت سے نیم پاگل ہو رہا تھا لیکن چند منٹ میں اس نے اپنے کو سنبھال کر کہا۔

"دیکھو ہیس مجھے الزام نہ دو۔ میں نے جو کچھ کیا تھا وہ سوامی کا مقابلہ کرنے کے لئے ٹھیک تھا۔ لیکن تم نے جو اس پر عمل کیا تو بہت بڑی غلطی کی"

ہیس بپھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس کیجیے۔" اپنی قیمتی باتوں کو اپنے ہی تک رہنے دیجیے اچھا خدا حافظ ــــ"

فارسٹر:۔ تم کو اس حالت میں چھوڑ دوں؟"

ہیس:۔ "میں آپ کی صورت نہیں دیکھ سکتی ہوں۔ جائیے ــ ابھی جائیے ــ"

ہیس یا تو رنج و غم سے گری جا رہی تھی یا بپھر کر کھڑی ہو گئی اور ایک منٹ کے لئے بھی فارسٹر کے ٹھہرنے کی روادار نہیں ہوئی۔ اور اسے نکال دیا۔

فارسٹر کو گھر آکر خبر ملی کہ سوامی کی خاک شدہ ارتھی نے دوسرا جنم لے لیا ہے۔ یعنی شہر والے جان دینے والے نوجوان کی ارتھی کل بڑی دھوم دھام سے نکالنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ فارسٹر کی حالت اس کسان ایسی تھی جس کا کھلیان اس کے ہاتھوں جل کر اچھی زندگی گزارنے

کی امید وں کو لے کر غائب ہو گیا ہو - اور خو نخوار قرضخواہ دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو ـــــــ اختیارات کی بھوک عزت و ترقی کی خواہشیں اس قسم کی سب امنگیں نہ جانے کس طرح خاک ہو چکی تھیں۔ صرف اس بات کا احساس تھا کہ جیسے میں نے کل کے قتل وغارت کے کاروبار کے لیے اپنے کو تیار کرنا ہے۔

فارسٹر خود اعتمادی کی بھیک مانگنے پھر وھسکی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ صبح جب وہ فائرنگ کرانے جا رہا تھا تو اس کے جسم میں ارادے کی جگہ وھسکی کام کر رہی تھی ؛

بارہ برس کے بعد

آج میر ولایت حسین کی باچھیں کھلی جارہی تھیں. خوشی کے مارے مصنوعی بتیسیاں بند ہی نہ ہوتی تھیں۔ میر صاحب کے ایسے ضبط کے شخص کا اتنا خوش ہونا تعجب خیز تھا. لیکن پھر بھی کسی کو تعجب نہ تھا کیونکہ سب محسوس کررہے تھے کہ تنہا نرینہ اولاد کا بارہ سال غائب رہنے کے بعد واپس آنا یہ تو اتنی بڑی بات تھی کہ اس پر وہ جتنا بھی خوش ہوتے تھوڑا تھا۔

اسٹیشن پر شبو میاں کی پیشوائی کے لئے میر ولایت حسین کے ساتھ خاندان کے سب لوگ موجود تھے۔ چچا، چچازاد بھائی. دور کے عزیز اور ان کے بچے. لیکن ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی آگئے تھے۔ شبو کے ساتھ کا کھیلا ہوا نبی بخش جواب حاجی صاحب کہلاتا تھا اور

لکڑی کے ٹھیکے سے جس نے سہ منزل عمارت بنائی تھی، وہ بھی پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ مولوی بہار عالم بھی تھے جو میر ولایت حسین کے بڑے دوست تھے۔ ان دونوں کے علاوہ چودھری عماد الدین بھی آئے تھے جن کی لڑکی کبھی شبو سے منسوب تھی۔ لیکن شادی ہونے کی نوبت نہ آئی تھی

ولایت حسین شبو کے خط کے آنے کا قصہ ہر ایک سے کہہ چکے تھے۔ لیکن ان کا جی نہیں بھرا تھا۔ اس وقت پھر وہ اس قصے کو حاجی صاحب سے دہرا رہے تھے۔

"حاجی صاحب اس روز فجر کی نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا کیا میرا سلسلہ نسب اسی طرح ختم ہو جائے گا؟ اور میرے منہ پر شبو نے جو کالک لگائی ہے وہ زندگی بھر نہ دھلے گی؟ اتنے میں ڈاکئے نے لا کر خط دیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو خط حجاز سے آیا ہے۔ کھولتا ہوں تو شبو میاں کی تحریر ہے۔ وہی شان خط اور وہی دائرے جو بارہ برس ادھر تھے۔ پڑھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ شبو میاں ماشاء اللہ سے حج کو گئے ہیں۔ اور وہیں خدا نے ان کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ ان کو اپنی حرکتوں سے توبہ کر کے گھر واپس آجانا چاہیئے۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ قبلہ گاہی اگر میری خطاؤں کو معاف کر دیں تو میں گھر واپس آجاؤں اور اشاروں کنایوں میں اس بات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں کہ ان سے اور اس عورت سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ میں نے خط پڑھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ اس نے میری خاندانی شرافت کی لاج رکھ لی۔ میں نے فوراً تار دیا کہ زیارت سے مشرف ہو کر گھر آجاؤ۔"

پھر میر صاحب حاجی صاحب کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگے۔

حاجی صاحب ۔ "تم تو بھی شبو کے بقول ننھے لنگوٹیا یار ہو
تم سے بڑھ کر اس کا بھلا چاہنے والا کون ہو گا ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ
تمہارا شبو بھٹکنے نہ پائے تو اس کی کہیں اچھی جگہ شادی کرا دو۔
حاجی ۔ "کوئی گھرانا ہے آپ کی نظروں میں ؟"
میر صاحب ۔ "چودھری عماد الدین کی بڑی لڑکی شبو سے منسوب
تھی لیکن شادی نہ ہو سکی ۔ اب تو اس کی منجھلی لڑکی کی بھی شادی ہو چکی
لیکن چھوٹی ابھی کنواری ہے ۔ اگر چودھری صاحب مان جائیں تو بڑی
اچھی بات ہو ۔ شبو کی بگڑی عزت بن جائے ۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ
اللہ رکھے میرے گھر میں کھانے پینے کی کمی نہیں ۔"
حاجی ذرا سوچ کر کہنے لگا ۔
"کچھ پتہ چلا کہ شبو کا اور اس عورت کا کیا تعلق تھا ۔ میرا
مطلب یہ ہے کہ آج کل ایک ایسی شادی کا بھی تو چلن ہے جس میں
مرد بھی طلاق نہیں دے سکتا ہے ۔ کہیں شبو نے وہ شادی تو
نہیں کر لی ؟"
میر صاحب کو یہ سوال اچھا نہیں لگا ۔ جب شبو کہہ رہا ہے
کہ وہ عورت کو چھوڑنے پر تیار ہے تو پھر کھود کھود کر ایسے سوال
نکالنے کی کیا ضرورت ۔ میر صاحب کو خیال آ گیا کہ جن لوگوں کی صحبت
میں شبو اٹھتا بیٹھتا تھا اور جو اس کی خرابی کے ذمہ دار ہیں ان میں
حاجی بھی ہے ۔ میر صاحب نے مصلحت کو سامنے رکھ کر جواب دیا ۔
"شبو نے اس طرح کی شادی نہیں کی ۔"
حاجی ۔ کوئی بچہ ہے اس عورت سے ؟"

میر صاحب۔ "نہیں"۔

میر صاحب کو ان باتوں کا کوئی پتہ نہیں تھا لیکن انہوں نے مصلحت کی مناسبت سے یہ جواب دے دیے۔ اتنے میں ریل کے آنے کا شور ہوا۔ اور بات یہیں پر ختم ہو گئی۔

میر شہاب الدین جو اب بارہ سال کے بعد حاجی ہو کر لوٹے تھے ریل سے اترے۔ باپ نے ان کو چمٹا لیا۔ اور اس خوشی میں چند آنسو بھی ٹپکا دیے۔

شبو کی گھر پر بڑی دھوم سے پیشوائی ہوئی۔ ماں نے صدقہ اتارا۔ خیرات بانٹی۔ چاروں بہنوں نے رت جگا کیا۔ خوب گانا بجانا ہوا۔ روزانہ شبو کے پسند کی چیزیں پکتیں اور ان کے یار دوستوں کی دعوتیں ہوتیں۔ پورا گھرانہ شبو میاں کی خاطر مدارات میں لگا رہتا۔ دوسری طرف چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی بھی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گھر بھر پر ایک جوانی کا عالم چھایا ہوا تھا۔

شبو نے آتے ہی اپنے ہم سنوں اور نوجوانوں میں جگہ بنالی بلکہ اس حلقے کا تو وہ ہیرو بن گیا۔ کیونکہ وہ تمام باتیں جن کے کرنے کی اس کے ہم سنوں اور نوجوانوں کو تمنا تھی ان کو یہ کر چکا تھا۔ جن ایکٹرسوں کے بارے میں وہ لوگ خواب دیکھا کرتے تھے ان کے ساتھ یہ بارہ سال گذار چکا تھا۔ اس لئے وہ سب اس کی باتوں کو بہت شوق سے سنتے تھے۔ یہ چاہے جتنا نمک مرچ لگائے وہ بلا تکلف اس کی داستان کو ہضم کر جاتے تھے۔

لیکن شبو شروع شروع میں اپنی بہنوں، رشتے کی بہنوں اور

رشتے کی بھاوجوں سے کترا تا تھا۔ کیونکہ جن عورتوں کا اسے تجربہ تھا یہ ان سے بالکل مختلف تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا کہ یہ لوگ بھی اس کی مثنوی زہرِ عشق سننے کے لئے کچھ کم بے چین نہیں رہیں۔ بلکہ اس کی بری حرکتوں کی وجہ سے وہ اس کی کچھ قدر بھی کرتی ہیں۔ ایک دن بھاوجوں نے بہت اصرار سے پوچھا:۔

شبو بھیا! تم کو ماہ پارا میں ایسی کون سی بات نظر آئی جو تم نے اس کے پیچھے ہم سب کو چھوڑ دیا۔ اور بارہ برس اس طرح بتا دیئے گویا نہ تم کسی کے تھے اور نہ تمہارا کوئی تھا"

یہ سوال کچھ ایسے ذوق شوق سے کیا گیا تھا کہ شبو ترنگ میں آکر آپ بیتی سنانے لگا۔

"دراصل جوانی کا جوش تھا۔ جو میرے سر پر بھونچال بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے الگزنڈرا کمپنی میں ماہ پارا کو جو شیریں کا پارٹ کرتے دیکھا تو اس کی ہر ہر ادا پر لٹو ہو گیا۔ جب تک لکھنؤ میں وہ کمپنی رہی روزانہ تماشے دیکھتا رہا اور جب کمپنی بمبئی چلی تو میں ہوسٹل سے بلا کسی کے کچھ کہے بمبئی چلا گیا۔ بمبئی میں دن بھر ماہ پارا کے گھر کا طواف کیا کرتا۔ اور رات کو تھیٹر دیکھتا۔ جب میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی نہ رہ گئی اور ابا جان نے خطوں کا جواب تک نہ دیا تو میں تھیٹر کے منیجر کے پاس نوکری کی تلاش میں گیا۔ اتفاق سے ایک چھوٹی سی نوکری مل گئی۔ اور اس طرح ماہ پارا سے بھی باتیں کرنے کا موقع مل گیا۔ جب اس کو میرے جنوں کا حال معلوم ہوا تو وہ بھی پسیج گئی۔ لیکن اس کی ماں۔ نانی اور بھائی میری

راہ میں حائل تھے۔ کیوں کہ پارا ان سب کا ذریعہ معاش تھی۔ وہ لوگ پارا کو کچھ ایسا سبق پڑھا دیتے تھے کہ مجھ سے بھڑک جاتی تھی۔ ایک دن جب میں نے اس رویہ کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگی کہ تمہارا کیا بھروسا۔ جب تمہارا جی بھر جائے گا تم مجھے چھوڑ دو گے۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بلکہ میں تمہارے لئے اپنے خاندان کو چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد اس نے اپنی ماں۔ نانی اور بھائیوں کو چھوڑ دیا اور میری ہو گئی۔ پھر میں نے بھی شرافت دکھلائی۔ اور بارہ سال نباہ کیا۔"

ایک بھاوج نے پوچھا۔ "کیا وہ تھیٹر میں کام کرتی رہی؟"

شبو اس سوال پر ذرا سٹ پٹا گیا۔

شبو۔ "ہاں۔ نہیں۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے کہا کہ اب تم گھر میں بیٹھو۔ اور میں کماؤں گا۔ پھر میں نے نوکری کر لی۔ اور وہ گھرداری کرنے لگی۔ لیکن بمبئی میں عورتوں کے نوکری کرنے کا رواج ہے اس لئے اس نے پھر نوکری کر لی۔"

بھاوج میں تجسس اتنا زیادہ تھا کہ انہوں نے پھر اسی بات کو کھود کر پوچھا۔

"وہ اب کیا کرتی ہے؟"

شبو نے ہنس کر کہا۔ "تم تو اس طرح پوچھ رہی ہو گویا اسے بلا کر اپنی بھابی بنانے کا ارادہ ہے۔"

بھاوج۔ "اے لو ج۔"

شبو کے قصے میں بہت سی کڑیاں چھوٹی ہوئی تھیں۔ وہ یہ کہ

ماہ پارا کے ساتھ بارہ برس کس طرح نبا ہے؟ جدائی کیوں ہوئی۔ دونوں میں نکاح ہوا تھا یا نہیں۔ اس سے کوئی بچہ بھی ہوا یا نہیں۔ لیکن شبو ان سوالوں کو ہمیشہ ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔ یا پھر ایسی متضاد باتیں کہتا تھا کہ ان کو ایک نقطہ پر لانا محال ہو جاتا۔

جب کبھی شبو اپنے رومان کی داستان چھیڑتا تو ایک شاعر کی طرح پارا کو دنیا کی ہر خوبی سے آراستہ کر دیتا لیکن جب وہ اپنی شادی کے سلسلے میں یقین دلاتا کہ اس کی اور پارا کی جدائی اب مستقل ہو گئی ہے تو وہ پارا کے لئے کہتا کہ وہ رنڈی ہے اور رنڈی کس کی ہوئی ہے وہ جب میری تھی جب بھی ہر ایک سے ہنستی بولتی تھی۔

جب نسبت کے سلسلے میں چھان بین کی جانے لگی اور شبو سے پوچھا گیا کہ اس نے پارا سے سول شادی تو نہیں کر لی ہے تو اس نے کہا کہ اس نے کسی قسم کی شادی نہیں کی ہے۔ جب میر صاحب کو یہ خبر ملی تو انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ ان کی قیاس آرائی سچی نکلی اور کہنے لگے۔

"کیوں نہ ہو۔ آخر ہے شریف کا خون۔ وہ ایک رذیل سے شادی کیسے کر سکتا تھا۔"

چودھری عماد الدین نے آخر حامی بھر لی۔ اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ باہر سے مہمان آنے لگے اور گھر کی گھما گھمی بڑھ گئی۔

ان دنوں مہمانوں کے ساتھ ایک اجنبی برقع پوش عورت ساتھ دو چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو لیے ہوئے آئی۔ لیکن زنانے میں جانے کے بجائے وہ مردانے میں ٹھہر گئی اور وہاں اس نے شبو

کو بلو ایا اور اسے الگ لے جا کر باتیں کرنے لگی ۔ یوں گھنٹہ تک آہستہ آہستہ باتیں ہوتی رہیں اور پھر ایکا ایکی عورت چیخنے لگی ۔

"تم اب مجھے چھوڑ رہے ہو جب کہ میں جوانی کھو چکی ہوں ۔ اور جو کچھ کمایا تھا سب تم کو کھلا چکی ہوں ۔ میرے ہی پیسوں سے تم نے حج کیا ۔ تم مجھ پر تھیٹر میں دوبارہ نوکری کرنے کا الزام لگاتے ہو؟ میں نے نوکری کی تھی تو تمہاری مرضی سے کی تھی ۔ تم اس وقت بیکار تھے ۔ اور گھر میں دو پیسے بھی نہ تھے ۔ تم اور مجھ پر بے وفائی کا الزام لگاؤ ؟ تم ؟ جس نے میرے ہوتے ہوئے بھولی سے آشنائی کر لی ۔ شانتی سے آشنائی کر لی ۔ مایا کے پیچھے پیچھے گھومتے پھرے ۔ میں نے یہ سب ظلم سہے ۔ مگر نہ الگ ہوئی اور نہ تم کو دھوکا دیا ۔ اس وقت درجنوں سیٹھ اور پیسے والے میرے طلبگار تھے ۔ میں سمجھتی تھی کہ تمہارے دل میں چور ہے ۔ کیونکہ تم شادی کی بات کو ٹال دیا کرتے تھے ۔ پھر بھی میں نے تم پر بھروسہ کیا ۔ ہائے کس طرح اپنے کو برباد کیا ۔"

عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ اور ہچکیاں لے لے کر کہنے لگی ۔

"دغاباز ۔ یہی وعدہ تھا نباہ کا ؟ بارہ برس نباہ دیا تو گویا کمال کر دیا یہ نہیں دیکھتے ہو کہ کس حالت میں چھوڑ رہے ہو؟ اب میں کہاں جاؤں اور تمہاری ان لڑکیوں کو کیسے پالوں ؟"

پھر آنسوؤں میں عورت کی آواز ڈوب گئی ۔

عورتیں زنانے گھر کے دروازوں کی درازوں سے کان لگائے ۔ یہ باتیں سن رہی تھیں ۔ گھر بھر پر پریشانی کا عالم طاری تھا ۔ کسی کو

کھانے پانی کا ہوش نہ تھا۔ شبو کی ماں بہنوں کو یہ ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والی بننے والے دولھا کو پھر نہ لگا لے جائے۔

کیا مرد اور کیا عورتیں سب اس عورت کی ننگی باتیں سن کر شرم سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔

خدا خدا کر کے صبح کا گیا ہوا شبو تین بجے گھر کے اندر آیا۔ لیکن اس حالت میں کہ چہرے کا رنگ اڑا ہوا۔ آواز کانپتی ہوئی اور قدم تذبذب سے اٹھتے ہوئے۔ اس نے بہنوں سے کہا۔

"وہ ابا جان سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے بغیر نہیں جائے گی"۔

ابا جان نے جو لڑکیوں سے یہ بات سنی تو وہ گھبرا گئے۔ اور کہنے لگے۔

میں اس سے کیا باتیں کروں گا۔ میں ایسی عورتوں سے نہیں مل سکتا ہوں"۔

لیکن عورت اس بات پر اڑی ہوئی تھی کہ میں ابا جان سے ضرور ملوں گی اور اس کے بغیر نہیں جاؤں گی۔ آخر ادھر سے انکار اور ادھر سے اصرار میں شام ہو گئی۔ اب سب گھبرائے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کا بہانہ لے کر عورت ٹھہر جائے۔ زبردستی اس کے ساتھ اس ڈر سے نہیں کی جا سکتی تھی کہ کہیں وہ سڑک پر نکل کر شور نہ مچانے لگے۔ جس سے سب کی ذلت ہو گی۔ اور نسبت الگ ٹوٹ جائے گی۔

عورت کو سمجھانے کے لئے شبو کے چچازاد بھائی گئے۔ انہوں نے ہنسی میں عورت کو بھابی بھی کہہ دیا۔ لیکن جب لڑکیوں نے

چچا چچا کہا تو انہوں نے جھڑک دیا۔ ان کے سمجھانے بجھانے کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر عشا کی نماز کے بعد میر صاحب کانپتے ہوئے قدموں سے عورت سے ملنے گئے۔

عورت نے کھڑے ہو کر ادب سے تسلیم کی اور پھر پاؤں پکڑ کر رونے لگی۔ اور رو رو کر کہنے لگی۔

"میں نے جوانی آپ کے بیٹے پر تصدق کر دی۔ اب وہ مجھے چھوڑ رہا ہے۔ یہ دو چھوٹی چھوٹی آپ کی پوتیاں ہیں۔ ان کو لے کر میں اب کہاں جاؤں۔ ماں مر چکی ہے۔ بھائیوں کو اس کے لئے پہلے سے چھوڑ چکی ہوں۔ خدا کے لئے آپ میرے اور اپنی پوتیوں پر رحم کھائیے۔ آپ تو شریف لوگ ہیں جس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اس کے ساتھ زندگی نباہ دیتے ہیں۔"

میر ولایت حسین یہ فرمائش سن کر آگ ہو گئے۔

"تو۔ تو آئی ہے پھر میرے لڑکے کو بہکانے۔ تو جس نے بارہ برس اس کو ماں باپ سے نہ ملنے دیا۔ اور اس کو حرام کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا تھا چل نکل یہاں سے۔"

وہ پاؤں پکڑے روتی رہی۔ ساتھ کی دونوں بچیاں بھی روتی رہیں لیکن میر صاحب بگڑ کر پاؤں چھڑا کر چلے آئے۔

تھوڑی دیر کے بعد عورت میر صاحب کے گھر سے نکلی۔ اس کی بغل میں گٹھڑی تھی۔ اور دونوں طرف دونوں لڑکیاں تھیں۔ میر صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ رذیل عورت میرے ہونے والے سمدھیانے نہ جا پہنچے۔ اس لئے

انہوں نے ملازم کو ساتھ کر دیا۔ کہ پیچھے پیچھے جاؤ اور دیکھو کہ یہ کہاں جاتی ہے۔

عورت نے ایک گلی میں ایک روٹی کی دوکان پر لڑکیوں کو دال روٹی لے کر کھانے کو دی۔ وہ کھاتی رہیں اور یہ روتی رہی۔ جب وہ دونوں کھا چکیں تو وہ لڑکیوں کو لے کر اسٹیشن چلی گئی ؛

شکرگزار آنکھیں

(۱)

اکتوبر ۴۷ء سے پہلے میرے سینے میں ٹیکتے ہوئے سات سات چھالے تھے۔ اور سانپوں نے مل کر دل کو پھوڑا بنا دیا تھا۔ ماں باپ کے قتل کا چھالا۔ جوان بیٹے کے قتل کا چھالا۔ دودھ پیتی بیٹی کے قتل کا چھالا۔ اور جیون سنگھی گھر کی لکشمی کے قتل کا چھالا۔ اللہ اکبر کے نعروں۔ پاک داڑھیوں اور نمازی پیشانیوں نے ان کے مظلوم جسموں کے اندر سے کس کس بے دردی سے روح نکالی ہے اور میری بیوی کے ساتھ کیسی کیسی شرمناک حرکتیں۔ اور معصوم بچوں کا ماں کی آنکھوں کے سامنے قیمہ بنایا جانا! اف فوہ —— میں خود کیسے بچا اور بچ کر کیسے شرنارتھی کیمپ تک آیا یہ بھی ایک

المیہ داستان ہے۔ اور پچھلی داستانوں کی طرح زخموں اور آنسوؤں کی لمبی لڑی ہے۔ پہلے تو ان داستانوں کے بیان کرنے کی مجھ میں ہمت ہی نہ تھی۔ اب ہمت تو ہے۔ پر قدرت نہیں۔ کیونکہ جلتے الفاظ اظہارِ درد کے میرے پاس ہیں دل ان سب کو نکما قرار دیتا ہے۔

گذشتہ منگل یعنی میرے پتر جنم سے پہلے یہ تمام ہولناک منظر دن میں سینکڑوں بار میرے دل میں آ آ کر گھوم جاتے تھے۔ جاتے وقت مجھے کھولتے کڑھاؤ میں جھونک جاتے تھے۔ جس میں جلتے جلتے جھلتے جھلتے میں مجسم شعلہ بن جاتا تھا۔ اور پھر ایٹم بم بن کر ساری اسلامی دنیا پر گرتا تھا۔ اسے بھسم کر ڈالتا تھا۔ اور خود بھی بھسم ہو جاتا تھا۔

گذشتہ منگل کو میں آدھی رات تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پر پلک سے پلک نہ لگی۔ گھنگھور گھٹا برس کر نکل چکی تھی۔ شرنارتھی کیمپ کے گرد جگنو جگمگا رہے تھے۔ اور زخموں کو مہکانے والی ہوا چل رہی تھی اتنے میں ہائے پپیہے نے صدا دی۔ پی کہاں!! پی کہاں!! یہ صدا دل میں بندوق کی گولی کی طرح اتر گئی اور مجھے میری جنم بھومی میں اڑا لے گئی۔

ہائے وہ بھرا پرا گھر!! وہ چہل پہل، ہائے وہ ہنسی اور چہلیں!! ہائے وہ نت نئے ارمان!!! ان یادوں سے کیمپ جل خانہ بن گیا۔ زندگی اندھیری ہو گئی۔ اور میں بے اختیار کیمپ سے نکل کر دیوانہ وار دیرانے کی طرف چل کھڑا ہوا۔

میں بہت تیزی سے ایک سمت چلا جا رہا تھا۔ بھاگا جا رہا تھا۔

بھاگا جارہا تھا۔ گویا لپک کر ہیں گذرے ہوئے دنوں کو پکڑ رہا ہوں۔
نہ جانے کتنی دیر تک یں چلا۔ اور کتنی دور نکل آیا۔ ایک بار ہوش جو
آیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک کھنڈر نے مجھے چاروں طرف سے گھیر
لیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی پامال قبریں بھی لایا ہے۔ بیچ میں
ایک ٹوٹا پھوٹا گنبد ہے۔ جو آخری تاریخوں کے چاند کی روشنی میں
اپنی اکلوتی انگلی سے پھٹے ہوئے بادلوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ مردہ
مسلمانوں کا استھان! میرے دل میں ایک ساتھ سکون وجلن کے
جذبات پیدا ہوئے۔ دفعتاً میری نگاہ ایک جگہ رک گئی۔ قبروں کے
بیچ میں ایک قبر انگڑائی لے کر اٹھی اور اٹھ کر میری طرف بڑھی مسلمان!
میں ٹھٹھکا اور پھر خوف اور انتقام کے مختلف جذبات کی وجہ سے
اپنی جگہ مذبذب ہو کر کھڑا رہ گیا۔ جب دیکھا کہ مرنے والا بڑھتا ہی چلا
آرہا ہے تو کڑک کر پوچھا۔" ہندو ہو کہ مسلمان ؟" وہ شخص بالکل میرے
پاس آگیا۔ اور سکون سے بولا "وہ تو ہندو ہے۔"

"وہ کون ؟"

"یہی۔"

"کیا یہاں کوئی شخص اور بھی ہے ؟"

اس نے ادھر ادھر گھوم کر دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

"نہیں تو"۔

"میں تم سے پوچھتا ہوں تم کون ہو۔ ہندو ہو کہ مسلمان ؟"

"میں ؟ میں ؟ میں ؟ میں نے اس پر ابھی تک غور نہیں کیا ؟"

"تم جھوٹے ہو۔ یقیناً مسلمان ہو۔ لیکن ڈر کے مارے چھپاتے ہو"

ڈر کس کا؟ کیا کوئی مجھے ڈرا رہا ہے؟"

یہ کہہ کر وہ شخص بہت اطمینان سے پاس کی قبر پر میری طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ الجھے بالوں، خاک اور تنکوں کا ایک جھنڈ تھا۔ جس نے مہینوں سے پانی، کنگھی یا قینچی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ خودرَو جھاڑیوں کی طرح اس کی مونچھیں اور ڈاڑھی تھیں جنہوں نے ہونٹوں اور ناک کے نتھنوں کو ڈھک لیا تھا۔ سر کے بالوں کی لٹیں اس طرح گالوں اور پیشانی پر جھول رہی تھیں جیسے گدڑیے فقیر کی الگنی پر چیتھڑے۔ مہینوں کے مریض کی طرح اس کے چہرے پر خون کی چھینٹ تک نہ تھی۔ لیکن اس تمام آخور کے اندر اس کی آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے گہرے کنوئیں کے نیچے موتی سا آب پیشہ ریں۔ جس میں سمندروں کو الٹ پلٹ کر دینے والی آندھیاں تک ہلکی سی جنبش بھی نہیں پیدا کر سکتی ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سکون اور اعتماد کی وجہ سے وہ شخص اس فساد و خون والی دنیا کی مخلوق ہی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ میں اس سکون کو دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ لیکن پھر میرا مضطرب دل مچلنے لگا۔ کہ میں تو اس کی نظروں کے کافوری پھائے اپنے زخموں پر لگاؤں گا۔ میں بیٹھ گیا۔ اور اس کی نظروں میں ڈوبنے سا لگا۔ دفعتاً اس کی آنکھوں نے پلکوں کے اندر غوطہ مارا۔ اور کچھ اس کل سے تڑپ کر نکلیں کہ مجھے خوف محسوس ہونے لگا۔ ان آنکھوں میں سکون اور اعتماد کے علاوہ کچھ اور بھی تھا کوئی ڈراؤنی اور گھنونی سی شئے۔ اسے محسوس کر کے میں نے اپنے کو ان آنکھوں کے ہپناٹزمی اثر سے آزاد کیا۔ اور چلنے کے

لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اٹھتے ہوئے دیکھ کر وہ شخص بولا۔
" تم مجھ سے کیوں نفرت کرتے ہو؟ میں وہ تو ہوں نہیں۔"
"وہ کون۔ مسلمان؟"
" نہیں۔ وہ مسلمان نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تو کئی مسلمانوں کو قتل کیا ہے اور مسلمان عورتوں سے مزے لوٹے ہیں۔"
" آخر وہ ہے کون؟"
دہی وہی۔ تم اسے نہیں جانتے۔ اچھا تو بیٹھو میں بتاتا ہوں کہ وہ کون ہے۔

(۲)

ایک ٹرین کے کمپارٹمنٹ میں چالیس پچاس مسلمان مرد عورتیں اور بچے بھرے ہوئے تھے۔ یہ سب کے سب پناہ گزیں تھے۔ کوئی زخمی تھا۔ کوئی بیمار تھا۔ کوئی فاقوں سے مر رہا تھا۔ کوئی گھر بار کی بربادی پر واویلا مچا رہا تھا۔ کوئی اپنوں کے قتل پر آنسو بہا رہا تھا سب ہولناک حقیقت سے امید موہوم کی طرف جا رہے تھے۔

کیونکہ ٹھہرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ قافلے کے سازو سامان کی یہ حالت تھی کہ اگر کسی کے ایک پاؤں میں جوتا ہے تو دوسرے میں ندارد۔ ایک جوان عورت کے کپڑے اس طرح تار تار تھے کہ ستر پوشی ناممکن تھی۔ ایک مرد کو کہیں سے ایک شکستہ لحاف مل گیا تھا جسے اس نے کمر سے لپیٹ کر تہمد بنا لیا تھا۔ لیکن کسی کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اور سکت بھی نہ تھی سب اپنی اپنی آگ میں غوطہ مارے غائب تھے۔ بڑے سے بڑے دکھی کی پکار۔ بڑے سے بڑے بروگی کی صدا ان کے کانوں کے

اندر نہیں جا سکتی تھی۔ لیکن ایک کونے میں انسانیت کی کچھ مہک بھی تھی۔ ایک نئی نویلی دلہن اپنے زخمی دولھا کو بڑی بہادری اور چالاکی سے خونخوار قاتلوں کے نرغے میں سے نکال لائی تھی۔ دولھا کے بازو پر تلوار کا گہرا زخم تھا۔ اور وہ بے ہوش پڑا تھا۔ مسافروں میں ایک ڈاکٹر بھی تھا جس نے زخم دیکھ کر کہا تھا کہ اگر کہیں سے گرم پانی اور صاف کپڑا مل جاتا تو میں زخم دھوکر باندھ دیتا۔ پھر کوئی خطرہ نہ رہتا لیکن اس دنیا میں گرم پانی کیسا پینے کے لئے پانی ملنا محال تھا۔ دلہن کے افشاں بھرے آنچل کے ٹکڑے سے زخم باندھ دیا گیا تھا۔ اور دلہن زخمی بازو کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اور مہندی لگے ہاتھ دولھا کے سر پر اس طرح پھیر رہی تھی جیسے اس سے زخموں کو بھرنے میں مدد ملے گی۔ نئی نویلی دلہن نہ رو رہی تھی اور نہ اپنا دکھڑا سنانے کے لئے بے چین تھی۔ ہاں جب اس سے کوئی خاص طور سے پوچھتا تھا تو وہ مختصر الفاظ میں بتا دیتی تھی کہ کس طرح اس کے گھر پر حملہ ہوا کس طرح اس کا سرتاج زخمی ہوا۔ اور کس طرح وہ موقع پاکر اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں کو خدا کو سونپ کر دولھا کو بچا کر لے بھاگی۔ اور پیٹھ پر لاد کر ایک میل چل کر ریل تک آئی۔

ریل چلی جا رہی تھی۔ اور سب اپنی اپنی حالت میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اور پھر ریل رک گئی۔ اس کے رکتے ہی دس پندرہ مسافر جو کمپارٹمنٹ میں ادھر ادھر منہ ڈھالے پڑے ہوئے تھے بپھرے شیروں کی طرح کھڑے ہو گئے کسی نے تھیلے کے اندر سے اور کسی نے بستر کے اندر سے کرپانیں۔

تلواریں اور خنجر نکال لیئے ۔اور بجلی کی طرح چمک کر مسافروں پر ٹوٹ پڑے ۔بات کی بات میں دس بارہ مسافروں کو خون آلود جانکنی سے ہم آغوش کر دیا ۔ مرنے والے کھینچنے لگے ۔اور جو بچ رہے تھے ان کی گھگھی بندھ گئی ۔ اور وہ سیٹوں کے نیچے چھپنے کی ناکام کوشش کرنے لگے ۔بھاگنے کی کوئی راہ نہ تھی ۔کیونکہ ریل کے نیچے بھی دونوں طرف مسلح جان لیوا سورما کھڑے ہوئے کہہ رہے تھے ۔

ہندو مت اونچا ہو!

مہاتما گاندھی کی جے!

مسلمانوں کا ناش ہو

ایک عورت بھاگنے کے لئے کھڑکی سے کودی ۔نیچے جو سورما کھڑے تھے انہوں نے فوراً اسے پکڑ لیا ۔اور جس طرح کوئی کیلا چھیلتا ہے اس طرح آناً فاناً میں سورماؤں کے تجربہ کار ہاتھوں نے اسے مادر زاد ننگا کر دیا ۔پھر وہ مشاق ٹائیسٹ کی طرح اپنی ہوس کی جلن ٹھنڈی کرنے لگے ۔ایک طرف لوٹ مار ہو رہی تھی تو ایک طرف برہنہ عورتیں اکٹھا کی جا رہی تھیں ۔ تاکہ ان کا جلوس نکالا جائے ۔ اور پھر ان کو شرمناک موت سے ہم آغوش کیا جائے ۔ یہ سب کچھ اس تیزی سے ہو رہا تھا جیسے کوئی ذہین بچہ رٹے ہوئے پہاڑے فر فر سنا دے ۔ نئی نویلی دلہن جو ایسے حادثوں کو اپنی آنکھوں سے ایک بار پہلے خود دیکھ چکی تھی اور درجنوں بار ایسی عورتوں سے سن چکی تھی جو ان کا شکار ہوئی تھیں ۔دلہن جانتی تھی کہ ان باتوں کی ابتدا کیا ہوتی ہے اور انتہا کیا ۔ وہ ایک نظر

میں بھانپ گئی۔ کہ صورت حال کیا ہے اور فیصلہ کر لیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ اس نے اپنا دوپٹہ لپیٹ کر تکیہ بنا کر دولہا کے زخمی بازو کے نیچے رکھ دیا اور اٹھ کر اندر اور باہر کے سورماؤں پر ایک نظر ڈالی پھر بے دھڑک ایک سورما کے پاس جا کر کہنے لگی :-

"مہاشے جی میری ایک منتی ہے"

"منتی ؟ ہوں۔ ہم تو تم کو چورا ہے کی کنیا بنا کر چھوڑیں گے آخر ہم اپنی ماں بہنوں کا انتقام کیسے لیں ؟ ہائے ری مسلمنٹی۔ یہ ابھار ——— جانی !——"

سورما نے اپنے خنجر کی نوک دولھن کی ایک چھاتی میں ذرا سی چبھو دی جس سے کرتے پر خون چھلک آیا۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ پر وہ بھاگی نہیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا وہ کھڑا ہوا تھا۔ دولھن اس کی طرف مڑی اور بولی۔

"مہاشے آپ ہی ایک عورت کی پرارتھنا سن لیجئے۔"

وہ کڑے تیوروں سے بولا۔

"تمہارے مسلمان بھائیوں نے بھی کسی دکھی ہندو عورت کی پرارتھنا سنی ہے۔"

دلہن نے ہاتھ جوڑ کر لجاجت سے کہا۔

"میری پرارتھنا صرف اتنی ہے کہ آپ مجھے ان دولھا کی طرف اشارہ کر کے) کے سامنے ابھی مار ڈالیے" بس۔ میں بہت احسان مانوں گی۔ خدا کے لئے۔ ایشور کے لئے۔"

دلہن کی بہادری کا قصہ وہ سن ہی چکا تھا۔ شاید اس وجہ سے

یا شاید اس کے گڑگڑانے کی وجہ سے بہر حال کسی وجہ سے وہ پسیج گیا۔ اسے دلہن پر رحم آ گیا۔ اس نے دلہن کی کلائی پکڑ کر ایک جھٹکے میں اسے دولھا کے پاس لا کر کہا۔

"لے یہ تیری خوشی سہی۔"

اس نے دلہن کے خنجر کا بھرپور ہاتھ مار دیا۔ دلہن ایک چیخ مار کر دولھا کے پاس گر پڑی۔ اس کی بجھتی ہوئی زندگی کی آخری بھڑک اس کی آنکھوں میں سیتا کا پریم بن کر آ گئی۔ اور اس نے ان آنکھوں سے شوہر کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر گھوم کر اس نے قاتل کی طرف دیکھا جب اس نے قاتل کی طرف دیکھا ہے تو اس کی پریم کی لپک سچی شکر گذاری کی مہک میں تبدیل ہو چکی تھی۔ کتنی شکر گذار تھیں وہ آنکھیں۔۔۔۔

اُف ــــ تو ــــ مانو وہ کہہ رہی تھیں تم نے مجھ بے یار و مددگار عورت پر جو احسان کیا ہے اس کے لئے میرا رواں رواں تمہارا شکر گذار ہے۔ پر افسوس ہیں زبان سے شکریہ تک نہیں کہہ سکتی۔ مگر یقین کرو کہ اس کی پیاری یاد لے کر مر رہی ہوں۔ رخصت۔"

دلہن نے اپنا دم توڑتا ہوا ہاتھ دولھا کے زخمی بازو پر رکھا۔ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور ایک ہچکی لے کر ختم ہو گئی۔

بیان کرنے والے نے اپنا قصہ جاری رکھا۔ کہنے لگا۔ ایک پرانی

بات ہے۔ فساد اور خون ریزی سے پہلے جب کبھی وہ اپنا خنجر صاف کیا کرتا تھا تو اس کو اس کی آبدار سطح کے نیچے ایک عکس نظر آتا تھا۔ اور جب کبھی اس سے آنکھیں چار ہوتی تھیں تو وہ کہتا تھا۔ دیکھ اس آبدار خنجر کو کسی کمزور پر مت چلانا۔ جواب میں وہ کہتا تھا۔ "میرے من! ایسی بزدلی میں کبھی نہ کروں گا"

نہ جانے کتنی بار اس عہد کی تصدیق ہوئی۔

جب خنجر دلہن کے سینے سے باہر آیا ہے تو دلہن کی شکرگذار آنکھوں سے اس کی آنکھیں بھی چار ہوئی تھیں اور اس کے دل میں سما گئی تھیں۔ دن پر دن گذرنے لگے۔ پر وہ آنکھیں اس کے من میں اسی طرح بسی رہیں۔ وہ اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں کو دیکھتا تو وہی شکرگذار آنکھیں نظر آتیں۔ چاند تاروں کو دیکھتا تو وہی شکرگذار آنکھیں نظر آتیں۔ اور خلا یا اندھیرے کو دیکھتا تو وہی شکرگذار آنکھیں نظر آتیں۔ اور جب آنکھیں بند کر لیتا تو اپنی روح کے ریشہ ریشہ میں وہی آنکھیں نظر آتیں۔ جس طرح گھنگھور گھٹا برس کر نکل جانے کے بعد دھنک نکل آئے ایسا دھنک جس کا ہر رنگ نگاہوں میں چبھا جا رہا ہو جیسے جارجٹ ساڑی میں سڈول جسم اسی دھنک کی طرح وہ آنکھیں اس کے دل میں کھلی ہوئی رہتی تھیں۔ وہ احسان مند آنکھیں، وہ شکرگذار آنکھیں۔

وہ کیا کہتی تھیں؟ کیا پیام دیتی تھیں؟ یہ اس کو معلوم نہ تھا مگر وہ دیتی تھیں کوئی پیام۔ وہ آنکھیں چکھنے میں مٹھائی کی ڈلیاں تھیں مگر خاصیت میں مالفل کی گولیاں۔ چھونے میں برف کی کنکریاں تھیں پر حلق سے اتارنے پر زہر میں بجھی ہوئی انیاں۔

بیان کرنے والے کی نظروں سے سارا سکون رخصت ہو چکا تھا۔ اور اب ان میں ایسی وحشت اور مظلومیت تھی کہ جی چاہتا تھا اس کی ہمدردی میں سر پھوڑ لوں۔ بیان کرنے والا فوراً دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کر بولا۔

"وہ شکر گذار آنکھیں۔" میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو وہ بادلوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک تارے کا بھی پتہ نہ تھا۔ بیان کرنے والا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔ پھر ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ ایک رات میں نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ جب وہ اپنا بچاؤ کرنے لگا تو ہم دونوں میں سخت کشتی ہوئی۔ آخر صبح ہوتے ہوتے میں نے ایک داؤ سے اسے پچھاڑا۔ اور اپنے قبضے میں کر لیا۔ اب وہ چیختا ہے۔ چلاتا ہے۔ خوشامدیں کرتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے پر میں اسے نہیں چھوڑتا ہوں جانتے ہو میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں؟

یہ کہہ کر بیان کرنے والے نے اپنے کپڑوں کے اندر سے ایک خنجر نکالا اور مجھے دکھا کر کہنے لگا۔ میں اس پر بڑا احسان کرتا ہوں وہ یہ کہ اسی کے خنجر سے اس کے جسم کو چھید چھید کر ان پیاری پیاری شکر گذار آنکھوں کو نگینوں کی طرح ان میں جڑتا رہتا ہوں۔ بیان کرنے والا یہ کہہ کر ہلکی سی مردہ ہنسی ہنسا۔ جو زہر خند سے مشابہ تھی۔ اور بولا بس اتنا ہی قصہ ہے۔

قصے کا سر پیر میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر کچھ خیال کر کے میں نے ڈپٹ کر کہا۔

"بتا کہ تو نے اس سورما کو کہاں چھپا رکھا ہے؟ تو ضرور مسلمان

ہے اور ایک بہادر ہندو کو سسکا سسکا کر مار رہا ہے۔"

اس نے سادگی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ تم اسے دیکھو گے؟ اچھا یہ ٹارچ لو۔ جب میں کہوں جلا دینا۔ اس شخص نے تلے اوپر تلے اوپر نہ جانے کتنے کرتے پہن رکھے تھے۔ ان کو آہستہ آہستہ اتار کر بولا۔

"ٹارچ روشن کر دو۔"

میں نے ٹارچ روشن کی تو دیکھتا ہوں کہ اس شخص کا سینہ اور بازو زخموں سے گندھے ہوئے ہیں۔ بعض گھاؤ تازے ہیں۔ بعض پرانے۔ اور بعض بعض تو اتنے پرانے کہ پک پک کر سڑ گئے ہیں اور ان میں کیڑے رِج بجا رہے ہیں۔ وہ شخص بولا۔

"یہ ہے وہ سورما اور یہ دیکھو وہ پیاری شکر گذار آنکھیں۔"

اب جو میں نے غور سے دیکھا تو واقعی اس شخص نے خنجر کی نوک سے گوشت میں سینکڑوں آنکھیں کھود لی تھیں۔ وہ شخص ایک رستے ہوئے زخم کو چٹکی سے مل مل کر کہنے لگا۔ یہی ہیں وہ پیاری شکر گذار آنکھیں۔

ملنے سے زخم اس طرح بہنے لگا جیسے کسی سِل کے مریض کا اگالدان الٹ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں پھر وہی قابلِ رشک سکون آ گیا۔ سارا نقشہ میرے لئے ایک ایسا معمّا تھا جس کا بوجھ لینا دل کو گوارا نہ تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تم خود کون ہو؟"

"میں ۔۔۔ میں وہی خنجر کے اندر نظر آنے والا عکس

ہوں۔"

اس رات میں نے جانا کہ بہادر مظلوم لاکھ درجے خوش نصیب ہوتا ہے بزدل ظالم سے ؎

ماں بیٹا

(۱)

مومنہ آندھی اور پانی میں رات بھر بھاگتی رہی۔ بھیگتی رہی ٹھٹھرتی رہی اور بھاگتی رہی۔ اندھیرا اس غضب کا تھا کہ دو قدم آگے کا درخت تک نہیں سوجھائی دیتا تھا۔ کھیت اور مینڈھ ٹیلا اور کھائی۔ پورب اور پچھم۔ زمین اور آسمان سب ایک غیر محدود سیاہ وسعت میں گم ہو گئے تھے۔ ہر قدم پر اسے اندیشہ تھا کہ میں کسی کنوئیں یا ندی یا نالے میں نہ جا گروں لیکن پھر بھی وہ بھاگتی رہی۔ بلکہ یہ اندیشہ تو بھاگنے میں اس کی اور ہمت افزائی کر رہا تھا۔ موت اچانک آ کر میری اس بے اور چھور کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ یہ تو ایک سہانا سپنا تھا۔ ایک بار تو اس نے یہ ارادہ بھی کر لیا کہ سامنے کے کنوئیں میں جسے بجلی نے چمک کر دکھا دیا تھا۔ اپنے کو گرا دوں۔ لیکن پاپی دل نے حامی بھی بھری تو رو کر۔ شاید

اس کو اب بھی امید تھی کہ کبھی نہ کبھی زندگی کے افق پر کوئی نہ کوئی کرن پھوٹ آئے گی۔ مورکھ!!

وہ بھاگتی رہی اور اندھا دھند بھاگتی رہی۔ لیکن اس کی زندگی ایسی نکمی تھی کہ نہ کھائی نے پوچھا نہ خندق نے نگلا۔ نہ بھیڑیے نے پھاڑا نہ سانپ نے ڈسا۔ نہ کوئی درخت پھٹ پڑا اور نہ بجلی نے بھسم کیا۔ پاپن ایسی جلی نا کوئلا بھئی نہ راکھ۔

مومنہ کو اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک بھاگتی رہی ہے کیونکہ کالی رات اگر دکھوں کی وجہ سے شبِ ہجر تھی تو انسانی درندوں سے اسے چھپا لینے کی وجہ سے شبِ وصل۔ اگر جسم کا جوڑ جوڑ چلا رہا تھا کہ اے صبح خدا کے لئے اب تو آجا۔ تو ظالم ہندوؤں سے ڈرا ہوا دل کہتا تھا کہ اے رات تو قیامت تک مجھے اپنی آغوش میں یوں ہی چھپائے رکھ۔

مومنہ جب تھک کر ایک پرانے برگد کی بھیگی جڑ پر گری ہے تو پو پھٹ رہی تھی۔ گھٹا چھٹ رہی تھی اور کچھ دور پیڑوں، مکانوں اور اندھیرے کے تودوں کے بیچ میں ایک شوالے کی چوٹی نظر آ رہی تھی شوالہ!! اسی کے ماننے والوں نے تو مسلمانوں پر ظلم ڈھائے ہیں۔ کتنے بچوں کو یتیم کیا!! کتنی عورتوں کو بیوہ کیا ہے!! کتنی عصمتوں کو ناس کیا ہے!! ایک دو نہیں، لاکھوں گھروں کو برباد کیا ہے۔ اور ابھی تک ان کی خون کی پیاس بجھی نہیں ہے۔

بارش سے دھلی ہوئی صبح کے آنے سے منظر میں رونق آ گئی۔ سرسبز کھیتوں نے انگڑائی لی۔ کووں نے کاؤں کاؤں کا شور مچایا۔ پیڑوں

نے نسیم کی لہروں پر تالیاں بجائیں، اور دور پر کسی بھینس نے اپنے بچھڑے کو پکارا۔ سامنے کے شوالے کے گرداب پیڑوں سے ڈھکے ہوئے کچے گھر بھی نظر آنے لگے تھے۔

یہ منظر ان لوگوں کے لئے جن کی زندگی دیہات ہیں گذری ہے غضب کی جاذبیت رکھتا ہے۔ مومنہ اسی ہیں کھو گئی اور اس کی تصوری نظریں ان گھروں کے اندر کی چہل پہل کو دیکھنے لگیں۔ کسان بیل کھول رہے ہیں۔ ان کی استریاں گائے کو دوھ رہی ہیں، لڑکیاں دودھ بلو رہی ہیں۔ دھوبی کپڑوں کی لادی گدھے پر رکھے گھاٹ جارہا ہے سامنے کے کچے گھر ہیں دبے ہوئے کنڈوں کو کرید کر آگ بنائی جارہی ہے۔ جوان ڈنڈ پیل رہے ہیں۔ عورتیں گاگریں لئے کنوؤں پر جارہی رہی ہیں۔ ان کے بچے سوتے سے اٹھے ہیں۔ اور بھوک سے آں غاں کر رہے ہیں۔

تصور نے یہ تصویریں کچھ اس طرح الاپی کہ مومنہ مست ہوگئی اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے غم و الم کو بھول گئی۔ اور پھر اس کے سینے ہیں زندگی اور امید کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔

گاؤں کے کنارے ایک پختہ مکان بھی تھا۔ جو مومنہ کو اپنا مکان یاد دلا رہا تھا۔ اس ہیں بھی بڑا سا پھاٹک لگا تھا۔ اور اس کی بغل ہیں بھی مردانہ کمرہ تھا۔ اور اس کے آگے بھی دو بڑے بڑے سایہ دار درخت تھے۔ ہائے اپنے گھر کے سامنے سایہ دار درخت!! جن کے نیچے اس کا بچپن گزرا تھا۔ اور اس کے نیچے مہرن شمس اور قمر بھی وہاں کھیلتے تھے۔ اسی داہنی طرف کے نیچے تو میں نے اور ہاجرہ نے تالاب

سے مٹی لاکر گھروندہ بنایا تھا۔ بنانے میں بجے کی انگلی میں شیشے کا ایک ٹکڑا لگ گیا اور خون نکل آیا۔ ہم دونوں خون دیکھ کر کتنا ڈر گئے تھے کہ اب گھر میں ڈانٹ پڑے گی لیکن چچی جان نے دونوں کو بچالیا۔ پھر اسی گھروندے میں ماجرہ کے گڈے اور میری گڑیا میں شادی ہوئی۔ ببو، شبراتن، بہارو، سنڈی اور نہ جانے کتنی لڑکیاں اکٹھا ہوئیں۔ اور گھروندا جو میرا گھر تھا وہاں برات آئی۔ برات بیٹھی تھی کہ درخت سے ایک املی گری اور میں نے دوڑ کر اٹھالی۔ بجے بولی واہ یہ املی تو برانیوں کا حق ہے۔ میں نے کہا کہ براتی آئے ہیں وہ کھانا کھائیں گے، جہیز لیں گے اور گڑیا کو بیاہ لے جائیں گے۔ یا سارا گھر لے لیں گے۔ پھر تو بجے بگڑ گئی۔ میں نے اس پر کہا کہ چلو میں بیاہ نہیں کرتی۔ پھر کیا تھا سب براتی بگڑ گئے۔ اور سخت جنگ چھڑ گئی۔ اتنے میں ادھر سے آنکلے دادا میاں۔ انہوں نے مجھے اور بجے کو پکارا۔ اور پوچھا کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا کہ املی میں نے اٹھائی تھی اس لئے میری ہوئی۔ بجے بولی کہ نہیں میری ہوئی دادا میاں نے سب لڑکیوں کو نام لے کر پکارا۔ ہم سب ڈر رہے تھے کہ اب سب ڈانٹے جائیں گے۔ لیکن دادا میاں پورا مقدمہ سن کر بجے سے کہنے لگے۔

"بتاؤ بٹیا تم املی لوگی یا آم"؟

املی سے آم کی باتیں۔ یہ پلٹا بہت مزے کا تھا ہم سب کے چہرے پر بحالی آگئی۔ بجے لہک کر بولی۔

"آم"

"کیوں لڑکیوں، کسے کسے آم کھاؤ گی؟"

ہیجے۔ "دو، دو!"

دادا میاں نے ہر لڑکی سے پوچھا۔ ہر ایک نے یہی جواب دیا "دو، دو" لیکن فتو ہمت کر کے بولی "تین تین" — پھر کیا تھا سب لڑکیاں چلا اٹھیں:-

"تین تین" "ہاں دادا میاں" "تین تین" میں نے دل کو مضبوط کر کے کہا۔

"چار چار" پھر تو ہر طرف سے شور ہونے لگا۔ "چار چار"، اسی طرح بولی بڑھتی گئی اور دس پر آکر ٹھہری۔ اس سے آگے بڑھتے لڑکیاں ڈر رہی تھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دادا میاں ناراض ہو جائیں۔ اور پھر جتنے آم مل رہے ہیں وہ بھی نہ ملیں۔

دادا میاں خاموشی سے سن رہے تھے۔ جب نیلامی بولی آگے نہیں بڑھی تو وہ کہنے لگے:-

"اچھا اگر تم کو گیارہ گیارہ ملیں؟"

اب تو لڑکیوں میں جیسے خوشی کی مرچیں لگ گئیں۔ وہ بے تابی سے چیخنے لگیں۔

"ہاں دادا میاں۔ گیارہ گیارہ"

"اور اگر بارہ بارہ ملیں؟"

لڑکیاں ٹھٹھے مارنے لگیں۔ دو چار دادا میاں سے چمٹ بھی گئیں سب شور کر رہی تھیں۔

"ہاں دادا میاں بارہ بارہ"

"اور اگر پیٹ بھر کے ملیں؟"

اب تو لڑکیاں ناچنے لگیں اور غل شور سے انہوں نے سارا گاؤں سر پر اٹھا لیا۔ اتنا شور ہوا کہ اور بچے بھی آنے لگے اور بھیڑ بڑھنے لگی۔

دادا میاں نے آواز دی۔ "میکو آموں کا ٹوکرا اور بالٹیوں میں پانی لے آؤ۔"

بالٹیوں میں پانی آ گیا۔ اس میں آم ڈال دیئے گئے۔ اور سب لڑکیاں اور لڑکے چوسنے لگے۔ آم کھلانے کے بعد دادا میاں نے دودھ منگوایا۔ اسے دیکھ کر ہندو لڑکے لڑکیاں کھسکنے لگے تو دادا میاں نے کہا۔

"کہاں چلیں؟ تمہارے لئے بھی دودھ آ رہا ہے۔"

ہندو بچوں کے لئے الگ دودھ آ گیا۔ ساتھ ساتھ آبخورے بھی دوپہر تک یہی ہنگامہ رہا۔

میری شادی بھی ان ہی درختوں کے نیچے ہوئی تھی۔ بڑا شامیانہ لگایا گیا تھا۔ نیچے دریاں۔ چاندنیاں اور قالین بچھے تھے۔ رنڈیاں "مبارک باشد" گا رہی تھیں۔ کتنا شور تھا۔ پلاؤ کی دیگ دے جاؤ۔ لفافی کہاں اڑ گیا؟ ارے دودھ کا گھڑا کس نے لنڈھا دیا۔ اے میکو، اے کلو، اے رمضانی۔ اے مدار بخش، اے منگل داس، اے بابا جی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس پر روشن چوکی کا شور، برتنوں کی کھنا کھن۔ دیگوں کی ٹھن ٹھن، بچوں کا رونا۔ گھوڑوں کا ہنہنانا، سب کیسا عجیب سا اور بھلا سا معلوم ہوتا تھا۔

میں دلہن بنی پسینے میں سڑا بور ایک کوٹھڑی میں منہ ڈھکے لیٹی تھی۔ رہ رہ کر ان کا خیال آتا تھا۔ دادا میاں کی یہی خواہش تھی کہ ان کے پوتی پوتا میں رشتہ ہو جاتے۔ اس لئے ان کے انتقال کے بعد ابا اور چچا نے رشتہ طے کر لیا۔ منگنی ہوتے ہی مجھے تو ان کے نام سے شرم آنے لگی اور پردہ کرنے لگی۔ لیکن وہ مجھے موقع نکال نکال کر تاکنے لگے۔ ان کی وہ شرارت کہ اس درخت میں جھولا ڈالا اور کھڑے ہو کر اتنے بڑے بڑے پینگ لینے لگے کہ میں کوٹھے پر تھی اس پر بھی ان سے نظریں مل گئیں۔ اس پر میں ہٹ گئی۔ پھر تو تانیں مارنے لگے۔

کاکل کی طرح آج جو بل کھائے ہوئے ہو

معلوم ہوا غیر کے بھڑکائے ہوئے ہو

میں اپنے دل میں کہنے لگی کہ یہ غیر یا تو اماں کو کہہ رہے ہیں یا ابا کو لیکن ان میں سے کسی پر یہ تہمت دھرنا کہ انھوں نے مجھے بھڑکایا ہے۔ کیسی بری بات ہے۔

مومنہ اپنا یہ بھولا پن یاد کر کے مسکرا دی۔ آج اسے جھولے کا قصہ برسوں بعد یاد آیا۔ ورنہ وہ اسے کب کی بھول چکی تھی۔

(۳)

مومنہ کی جب آنکھ کھلی ہے تو سورج چوتھائی آسمان طے کر چکا تھا۔ اور وہ دھوپ میں پڑی جل رہی تھی۔ کھیت، باغ مندر اور مکان سب دھوپ سے مالا مال تھے۔ مومنہ نے

انگڑائی لے کر زنگین اور سنہرے زمین و آسمان کی طرف دیکھا اور اٹھی۔ اٹھتے ہی اسے خیال آیا کہ کہیں کسی نے مجھے دیکھ نہ لیا ہو اور کہیں یہ گاؤں ہندوؤں کا نہ ہو۔ اس خیال کا آنا تھا کہ وہ کانپ گئی۔ اور اپنے کو اس طرح بے خبر سو جانے پہ بڑا بھلا کہنے لگی لیکن اسے کسی طرف آدمی کا نام و نشان بھی نظر نہیں آیا۔ کھیت خالی۔ باغ خالی۔ گلیارا سنسنہ خالی۔ گاؤں کے اندر بھی نہ کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر آرہا تھا۔ اور نہ کسی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسے یہ دیکھ کر اطمینان بھی ہوا اور حیرت بھی۔ گاؤں خالی کیوں ہے؟

کہیں ایسی بات تو نہیں کہ یہاں کے سب بسنے والے مسلمان ہوں اور وہ ڈر کر پاکستان بھاگ گئے ہوں۔ ممکن تو ہے ایسا! پر ابھی ذرا اور دیکھ لینا چاہیئے کہ وہاں کوئی ہندو یا سکھ تو نہیں ہے۔

مومنہ کو بھوک بہت سخت لگی تھی۔ ایک برساتی گڈھے سے پانی ہی کر اس نے پیٹ بھلا لیا۔ اس وقت اسے یہ خوش خبری ملی کہ اس کی قمیص اور ڈوپٹہ سوکھ چکے ہیں۔ صرف شلوار کمر کے پاس بھیگی رہ گئی ہے۔ مومنہ نے اطمینان کر کے کہ آس پاس واقعی کوئی آدمی نہیں ہے ڈوپٹہ کی تہمد باندھ لی اور شلوار سوکھنے پھیلا دی۔

جب مومنہ کی نظر اپنی برہنہ پنڈلیوں پر پڑی تو دل پر ایک سخت گھونسا لگا کہ ہائے اس جسم پر ان چار پانچ دنوں میں کیا کیا بیت گئی۔ ہائے کیسی بے حیائی کے دن رات کاٹنا پڑے ہیں۔ دو دو دن تک تو میرے اور میرے گاؤں کی پندرہ بیس عورتوں کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی تک نہ تھی۔ اس حال میں سو دو سو مردوں کے

بیچ میں رہنا پڑا۔ وہ ان کا شراب پی پی کر ننگے ناچنا اور مظلوم عورتوں پر جفائیں ڈھانا۔

اُف اس کلوٹے موئے بو دار گالی بکنے والے کے بازوؤں میں — کم بخت مسلمانوں سے نفرت کی وجہ سے مجھے استعمال کرتا تھا۔ ہائے میں کیوں لٹا رہ دیکھ سی۔ کیوں نہ میں بچے کی طرح دوڑ کر کنوئیں میں پھاند پڑی۔ میں بے حیا یہ شرمناک زندگی لے کر اب کہاں جاؤں بشرمناک سی شرمناک !!! اف !!! —

مومنہ کو اپنی دودھ پیتی بچی لاڈلی کا آنکھوں کے سامنے مارا جانا یاد آگیا اور پھر ایک ہائے کے ساتھ پورا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

یہی کوئی دن کے نو بجے ہوں گے۔ ابا باہر کی کوٹھڑی میں بھوسا بھروا رہے تھے تاکہ بارش میں خراب نہ ہو جائے۔ چچا نے باہر پیڑ کے نیچے حقہ منگوایا تھا۔ بچے مدرسہ سے جانے کے لئے روٹی مانگ رہے تھے۔ اور بہن جلدی جلدی ان کے کھانے کا بندوبست کر رہی تھی کہ ابا، چچا اور وہ بھاگتے ہوئے گھر میں آئے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آتے ہی چلائے۔ "پردے میں جاؤ۔ پردے میں جاؤ"۔ میں، چچی رقیہ اور لڑکیاں ابھی کمرے میں گھسنے بھی نہ پائے تھے کہ ابا نے پکارا۔ "اندر آجاؤ!" آواز کے ساتھ ہی خیراتی۔ مولا۔ گنی۔ جمعراتی سب لاٹھیاں لئے اندر آگئے۔ پھاٹک بند کر لیا گیا۔ ابا نے حکم دیا کہ "خیراتی تم اوپر چھت پر چڑھ جاؤ۔ چچا سے کہا تم گنی اور مولا کو لے کر پچھواڑے کے دروازے پر جاؤ۔ خود ابا ان کو ساتھ لے کر

پھاٹک کی طرف گئے۔

ان لوگوں کے آنے سے پہلے میں لاڈلی کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس وقت کچھ شور کان میں آیا۔ میں سوچنے لگی کہ ایک تو آج بازار کا دن نہیں ہے اور دوسرے یہ دہلی والی سڑک کی طرف سے آرہا ہے۔ یہ شور کیسا ہے! اب جو یہ ہنگامہ ہوا تو میں سمجھی کوئی بہت خوفناک بات ہے۔

ابھی ابا اور چچا وغیرہ اپنی جگہوں پر بھی نہیں پہنچے ہوں گے کہ شور ہمارے گھر کے قریب آگیا اور یہ نعرے سنائی دینے لگے۔

"بجرنگ بلی کی جے"

"مسلمانوں کا ناس ہو"

"خون کا بدلہ خون سے لے مسلمانوں کو بھارت سے نکال دو"

"مہاتما گاندھی کی جے"

بندوقیں دغیں۔ مرنے والوں کی چیخیں سنائی دیں۔ اور ذرا دیر میں ہمارے پھاٹک پر دھڑ دھڑ ہونے لگا۔ پھر اتنا شور ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کئی بندوقیں ایک ساتھ چھوٹیں۔ ابا کی چیخ سنائی دی۔ اور ساتھ بجرنگ بلی کی جے اور پھر ہمارا صحن حملہ آوروں سے پٹ گیا۔ ان لوگوں میں کھدر کی ٹوپیاں بھی تھیں، فوجی وردیاں بھی تھیں، سادھو اور سنیاسی بھی اور ہمارے گاؤں کے بہت سے ہندو بھی تھے۔ ذرا دیر میں یہ لوگ ایک بلی لائے اور اسے دس بارہ آدمی پکڑ کر جھونک دے کر جس کمرہ میں ہم تھے اس کے ایک کنواڑے پر مارنے لگے۔ وہ چرچر کرنے لگا

ہم سب کو اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ جو جو آیتیں یاد آئیں پڑھنے لگے بچوں کو سمجھایا کہ روؤ نہیں، خدا کو یاد کرو۔ اتنے میں چچا اور مولا کسی طرف سے دوڑتے ہوئے کمرے کی طرف آئے اور لاٹھیاں "تان کر دروازے کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ لیکن وہ ابھی قدم جما بھی نہیں پائے تھے کہ چھ سات بندوقیں ایک ساتھ چھوٹیں اور وہ دونوں جس جگہ تھے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ اور منہ سے چیخ نکل گئی۔ چچی نے کان میں کہا "بی بی — خدا کو یاد کرو!"

ان دونوں کے مرتے ہی دروازہ ٹوٹ گیا۔ حملہ آور اندر آگئے اور ہم سب کو پکڑ پکڑ کر بات کی بات میں گھر کے باہر پہنچا دیا۔ ایک جوان پستول ہاتھ میں لئے کھڑا احکام دے رہا تھا۔ اس نے میری اور مہرن کی صورت دیکھ کر کہا۔

"یہ لڑکی تو کام کی ہے اور یہ عورت بھی کچھ بری نہیں — لیکن اس کی گود میں کیا جھنجھٹ ہے۔ پھینکو اسے!!"

میں لاڈلی کو چمٹا کر بیٹھ گئی۔ لیکن تین چار جوانوں نے مجھے پچھاڑ کر لاڈلی کو چھین لیا اور ایک ٹانگ پکڑ کر زمین پر دے مارا۔ اس کا بھیجا بہہ نکلا۔ ہائے اس کی بجھتی ہوئی وہ نظریں!! ماں مر جاتی اس کے عوض۔ ظالموں نے اس پر ایک قہقہہ لگایا۔

لاڈلی کا دم نکلا ہی تھا کہ چند حملہ آور ان کو مع شمس و قمر کے کھینچتے ہوئے لائے۔ اور سردار سے کہا:۔

"یہ اپنے بچوں کو لے کر بھاگ رہا تھا"

وہ زخمی تھے۔ ہو سکتا ہے کہ بچوں کو بچانے کے لئے انھوں نے کچھ مقابلہ بھی کیا ہو۔ سردار نے حکم دیا کہ ان کو اسی طرح کنوئیں میں ڈال دو۔ سامنے ایک کنوئیں میں لاشیں پھینکی جا رہی تھیں۔ اسی میں وہ جھونک دیئے گئے۔ ہائے وہ اندر سے رہ رہ کر پکارتے تھے۔ "ظالمو! خدا کے لئے مجھے ایک گولی مار دو۔" ان کی طرف سے میں بھی ایک ایک کی خوشامد کرتی رہی۔ پر کسی نے گولی نہ ماری۔

شمس اور قمر کو تھامیں گولیاں ماردی گئیں۔ اور وہ ہائے اماں کہہ کر ختم ہو گئے۔ پھر مردہ بیٹوں کو زندہ باپ کے اوپر جھونک دیا گیا۔ آنکھوں کے سامنے میرا سارا خاندان مارا گیا۔ اور کنوئیں میں جھونک دیا گیا۔ مجھے اور مہرن کو ننگا کر کے ننگی عورتوں کے غول میں شامل کردیا گیا۔ اسی غول میں ہیجے بھی تھی۔ اور سر جھکائے مہرن کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اسی رات ظالموں نے خوب شرابیں پی اور ہم لوگوں کو بے دردی سے استعمال کیا۔ ہمارے آنسوؤں اور چیخوں سے ان لوگوں کو مزہ آتا تھا۔ اور جوش میں اضافہ ہوتا تھا۔ ہیجے موقع پاکر ان لوگوں کے بیچ سے نکل بھاگی۔ اور تیر کی طرح جاکر ایک کنوئیں میں جو سامنے کچھ دور پر تھا۔ کود پڑی۔ کیسی بہادر اور خوش نصیب تھی وہ!! ان لوگوں کو ایک مال کے ضائع ہو جانے کا افسوس تو بہت ہوا لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ نکالنے کی کوشش کرتا۔

صبح عورتوں کی تقسیم ہوئی۔ مہرن نامراد کو خدا جانے کون لے گیا میں کلوٹے خبیث کے حصے میں آئی۔ وہ لے کر اپنے گھر آیا۔ ہائے

وہاں کی شرمناک زندگی!! باتوں سے مجھے پتہ چل گیا کہ وہاں سے پاکستان کی سرحد قریب ہے۔ گزشتہ رات اندھیرے اور کالی گھٹا کو غمگسار پاکر گھر سے نکل بھاگی۔ اور اپنے حساب سے پاکستان کی طرف چل دی۔ اب پتہ نہیں کہ کہاں ہوں۔ ہائے مجھ بے حیا میں اتنی ہمت کیوں نہیں ہے کہ بچے کی طرح اپنی ناپاک زندگی کا خاتمہ کرلوں۔

ان خیالات کے ساتھ مومنہ کے دل میں ایک ہوک اٹھی جو دل و دماغ کو اس طرح تپانے لگی جیسے دہکتی بھٹی میں لوہا۔ آہ!! چاروں طرف نالے۔ تال۔ تلیاں۔ حد یہ ہے کہ ذرا ذرا سے گڈھے تک پانی سے لبریز تھے، لیکن مومنہ کی آنکھیں تھیں کہ دو بوند پانی کے لئے اس طرح تڑپ رہی تھیں۔ جیسے تپتے صحرا میں ریت کے ذرّے۔

کئی روز کی بارش کے بعد جو دھوپ نکلی تو چیونٹیاں انڈے سکھانے اور غذا جمع کرنے کے لئے باہر نکل پڑیں۔ ان کی ایک فوج نے ایک جیتی جاگتی بھڑ کو پکڑ لیا۔ اور درجنوں کی تعداد میں اس کے پیروں، بازوؤں۔ پیٹ اور سر میں چمٹ گئیں۔ اور اسے گھسیٹ کرلے چلیں۔ بھڑ پھڑپھڑاتی تھی۔ لیکن اس کے بازو اور پاؤں سب اس بے پناہ فوج کے سامنے بیکار تھے۔ اگر وہ تڑپ کر اپنے جسم کا کوئی حصہ چھڑا بھی لیتی تھی تو پھر اس جگہ ایک کے بجائے چار چیونٹیاں چمٹ جاتیں۔ چیونٹیاں بھڑ کو کشاں کشاں لئے جارہی تھیں۔ کھینچے لئے جارہی تھیں۔

مومنہ جب اپنی کہانی کو اپنے من میں دہرا رہی تھی۔ اس کی نظریں

بھڑ اور چیونٹیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنی داستان کے خاتمہ پر پہنچتے ہی اسے خیال آیا کہ ایک چیونٹی کاٹ لے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے پھر اس بیچاری بھڑ کا کیا حال ہو گا؟ بے رحم چیونٹیو! کس بے دردی سے ایک زندہ جسم کو کھا رہی ہو۔ کیا اناج کے دانے تم کو میسر نہیں آتے۔ اس بچاری نے تمہارا کیا بگاڑا تھا کہ ایک جان پر ہزاروں ٹوٹ پڑی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس بھڑ کے بچے ہوں اور اس کے نہ ہونے سے بھوکے پیاسے مر جائیں۔

مومنہ نے ایک تنکا اٹھا کر اس سے چیونٹیوں کو بھگا دیا۔ لیکن بھڑ اتنی زخمی ہو چکی تھی کہ وہ آزاد تو ہو گئی۔ پر اُڑ نہ سکی۔

افسوس اپاہج کر دیا اس بچاری کو۔ اب جیئے گی بھی تو سسک سسک کر۔ اس سے تو اچھا ہوتا اگر چیونٹیاں اسے ایک ہی دفعہ میں نگل جاتیں۔

مومنہ نے ایک پتے سے بھڑ کو اٹھا کر درخت پر بٹھا دیا۔ کہ وہ وہاں حفاظت سے رہے۔ جب اچھی ہو جائے اپنے چھتے چلی جائے ورنہ سکون سے مر جائے۔

شلوار سوکھ چکی تھی۔ دکھیا بھڑ کو بچانے کی خوشی کے علاوہ مومنہ کو ایک خوشی اور بھی میسر آگئی۔ وہ یہ کہ رات بارش میں بھیگنے کی وجہ سے اس کے گندے کپڑے، گندہ جسم اور گندہ سر بہ سب صاف ہو گئے تھے۔ بس کنگھی کی کسر تھی۔

مومنہ کا دھیان گاؤں کی طرف لگا ہوا تھا۔ اتنی دیر ہو چکی تھی

آبادی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ نہ کوئی آدمی آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔ نہ بچے کھیلنے نکلے تھے۔ اور نہ کھیتوں سے کسی نے کسی کو پکارا تھا۔ گاؤں یقیناً بے روح تھا۔

(۳)

مومنہ پگ ڈنڈی پگ ڈنڈی جا رہی تھی۔ لیکن بہت چوکنا۔ ہوا پر کان لگائے ہوئے۔ اور پتے پتے کی حرکت بھانپتی ہوئی۔ پگ ڈنڈی نے ذرا سا چکر دے کر دوسرے رخ سے گاؤں میں پہنچا دیا۔ گاؤں واقعی خالی تھا۔ ہر طرف آگ کی کارستانیاں اور تباہ کاریاں نظر آ رہی تھیں اور یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ بارش نے آ کر کوئلے کو راکھ ہونے سے بچا لیا ہے۔ چھتیں ڈھیر تھیں۔ کنوارڑے کوئلہ بن کر مکان کے سامنے آ رہے تھے۔ اور گھروں کے اندر نہ کوئی کھٹیا تھی، نہ برتن اور نہ کسی قسم کا سامان۔ یا تو کوئلہ تھا یا پھر مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے جو ہر گھر کے اندر اور باہر کثرت سے نظر آتے تھے۔

مومنہ آگے بڑھی تو حلوائی کی دوکان نظر آئی۔ اس کا خوانچہ سجانے والا چبوترہ باقی رہ گیا تھا۔ یہاں مومنہ کی نظر ایک ایسی چیز پر پڑی کہ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ غور سے دیکھنے لگی۔ یہ واقعہ تھا کہ چبوترے کی دیوار پر کوئلے سے اللہ اکبر لکھا ہوا تھا۔ جو بارش سے آڑ میں ہونے کی وجہ سے دھندلا سا باقی رہ گیا تھا۔ اس کے آگے بھڑبھو بجے کا بھاڑ ملا۔ یہاں بھی دیوار پر اللہ اکبر لکھا ہوا نظر آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ یہ گاؤں مسلمانوں کا تھا اور آگ نے ان کو بھگا دیا؟ لیکن ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ دیکھو ان کھیتوں کو جو کھڑے

لہلہا رہے ہیں۔ بھلا ان کو چھوڑ کر وہ لوگ کہیں دور جا سکتے ہیں لیکن اگر آس پاس ہوتے تو کھیتوں میں تو نظر آتے۔ پھر کیا ہوا؟

مومنہ کو اللہ اکبر دیکھ کر گاؤں سے ایک قربت سی محسوس ہونے لگی۔ گویا وطن سے بہت دور، ویرانے میں اسے ایک اپنا مل گیا۔ یہ گاؤں ویران ہونے پر بھی آباد محسوس ہو رہا تھا اور جی تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا کہ مومنہ اس کے در و دیوار سے لپٹ لپٹ کر اپنی وہ رام کہانی سنا دے جس کا سننے والا میسر نہیں آ رہا ہے۔ اور یہ پہاڑ سا بوجھ اس سے ہٹا لے۔

"گاؤں! مومنہ کو بے اختیار اپنا گاؤں یاد آ گیا۔ جس دن میں حسرت کے ساتھ اس سے رخصت ہو رہی تھی۔ کتنی ویرانی تھی اس کی آبادی میں!! ہر چہرا اجنبی، ہر آنکھ نفرت سے بھری، ہر مکان اپنے مکینوں کی یاد میں سوگوار۔ رحیم درزی کی دوکان پر نہ وہ تھا نہ اس کا لڑکا۔ نہ مشین نہ کپڑے۔ ایک اجنبی بیٹھا ہوا موٹے ڈنڈے سے بھنگ گھونٹ رہا تھا۔ ڈنڈے میں بندھے گھونگرو چھن چھن بول رہے تھے۔ اور وہ اس کی گت پر جھوم جھوم کر تانیں اڑا رہا تھا مرادی کے دروازے پر جو میدان تھا جہاں کل تک وہ اور اس کے بیٹے دوڑ دوڑ تاگے کے لچھے سلجھاتے تھے اور تانا تانتے تھے اور پھر تھان بنتے تھے جس میں ایسے ایسے پھول ڈالتے تھے کہ بس بیٹھے دیکھا کرو، وہاں اب میلی گندی عورتیں سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی جوئیں دیکھ رہی تھیں۔ سر دھو رہی تھیں اور سب کے سامنے نہا رہی تھیں اور بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں۔

ڈیوڑھی میں، عورتوں سے ذرا آڑ میں ایک جوان مگدر کی جوڑی ہلا رہا تھا۔

مرادی کے مٹھو میاں درخت سے لٹکے ہوئے اپنے کھانے کی کٹوری بجا رہے تھے۔ اور 'بی بی جی'، 'بی بی جی' کی رٹ لگا رکھی تھی۔ ایک لڑکی کچھ دینے آئی تو مٹھو میاں نے خوش ہو کر صدا لگائی۔ "منی جی بھیجو"۔

اسے سنتے ہی لڑکی نے ہاتھ روک لیا اور ایک ستر اسی برس کی بڑھیا نے دور سے چلا کر کہا۔

"اری چھوکری تو کس کا پیٹ پال رہی ہے۔ دیکھتی نہیں ہے کہ وہ حرامزادہ مسلمان ہے۔ مار ڈال اسے"۔

لڑکی نے پنجرا اٹھا کر پٹک دیا۔ لیکن مٹھو مرا نہیں۔ ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ اس میں فریاد تھی کہ آج تک کسی نے سوائے مٹھو میاں مٹھو میاں کہنے کے میرے ساتھ برا برتاؤ نہیں کیا۔ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو۔

جہاں پنجرا لٹکا تھا وہ جگہ مگدر ہلانے والے جوان کے سامنے تھی اور وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس نے باہر آ کر لڑکی سے کہا۔

"واہ ری چھوکری۔ مٹھی بھر کا مسلمان تجھ سے نہیں مرتا"۔

پہلوان نے رومال ہاتھ پر لپیٹ کر پنجرے میں ہاتھ ڈالا اور مٹھو میاں کی گردن مروڑ کر پنجرے کے باہر پھینک دیا۔ اور خود جا کر بدستور مگدر ہلانے لگا۔

پنجرے کے پٹ کھلے تھے اور وہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس سے ذرا ہی دور پر طوطا پڑا تھا۔ جس کی سرخ چونچ گردن لوٹ جانے

کی وجہ سے سبز پردں کے بیچ میں آگئی تھی۔ مٹھو میاں مٹھو میاں۔ نبی جی بھیجو۔ نبی جی بھیجو کی رٹ لگانے والی زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکی تھی۔

شاہی زمانے کی خوبصورت مسجد جسے دور دور سے لوگ دیکھنے آتے تھے۔ اس کے کٹاؤ دار محراب کو بیلچوں سے زخمی کر کے وہاں گیرو سے ایک مورت بنا دی گئی تھی اور گھنٹہ لٹکا دیا گیا تھا۔ اب وہ مندر تھا۔ جہاں ایک پجاری بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے گھر کی حالت!! اف یاد کر کے کلیجہ پھٹتا ہے۔

مومنہ ان خیالوں میں ڈوبی ہوئی شوالے تک آگئی۔ یہاں ایک چیز بالکل خلاف توقع نظر آئی۔ اس کے کلس سے ایک جانور کا سر لٹک رہا تھا۔ جس کی آنکھیں اور گوشت کوّے نکال کر کھا گئے تھے اور کھال بگڑ چکی تھی۔ لیکن پھر بھی سینگ اور چہرہ بتا رہے تھے کہ میں گائے کا سر ہوں۔ شوالے کے اندر شیو کا استھان توڑ پھوڑ ڈالا گیا تھا اور کوئلے سے محراب بنا کر اللہ اکبر لکھ دیا گیا تھا۔

مومنہ نے ادھر اس مسجد کو دیکھا اور ادھر اس کی ناک میں اتنی سخت تعفن آئی کہ جی متلانے لگا۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کے دل میں کچھ سکون ہوا کہ دنیا میں ایک جگہ تو ایسی نکلی جہاں مسجد نے مندر کو فتح کر لیا ہے ہو نہ ہو۔ یہ جگہ پاکستان ہے۔ خدا چاہے گا تو یہاں ایسے ایسے پرسکون نظارے بہت دیکھنے میں آئیں گے۔

(۴)

مومنہ دونوں درختوں کے نیچے کھڑی اس مکان کو دیکھ رہی تھی

جو دور سے اسے اپنے گھر سے ملتا جلتا نظر آیا تھا۔ اس کے گھر ہی کی طرح اس میں بھی باہر بیٹھکا اور بغل میں حاطہ تھا۔ جس میں برابر برابر بہت سی ناندیں لگی ہوئی ان بیروں کو یاد کر رہی تھیں جو ان سے گھنٹوں کاٹا پھوسی کرتے رہتے تھے۔ یہاں بھی حاطے کے اندر اور باہر مٹی کے برتنوں کے ٹھیکرے بکھرے پڑے تھے۔ بیٹھکے کے سامنے تینوں دروازے اور ایک وہ دروازہ جو بیٹھکے کے اندر سے گھر میں کھلتا تھا یہ سب یا ٹوپاٹ کھلے تھے۔ اور گھر کے اندر کا بہت سا حصہ نظر آرہا تھا۔ بیٹھکے کے بعد دالان تھا پھر بہت بڑا صحن پھر کھپریل جو جل کر نیچے ڈھیر ہو چکی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور دالان اور وہ بھی آگ کا شکار ہو چکا تھا۔

یہ بیٹھکا دیکھ کر مومنہ کو اپنا بیٹھکا یاد آگیا۔ وہ بھی اسی طرح پھاٹک کے بغل میں تھا۔ وہاں جاڑوں میں رات گئے تک تاش اور شطرنج ہوتی رہتی تھی۔ اور قہقہے گونجا کرتے تھے کبھی کبھی کوئی شخص تانیں بھی مارنے لگتا تھا۔ گراموفون کا چسکا لگ جاتا تھا تو روز وہی بجا کرتا تھا۔ وہی گنتی کے چند ریکارڈ تھے سننے والے۔ روز سنتے تھے دن میں دو دو تین تین بار اور کبھی کبھی تو دن دن بھر سنتے تھے۔ مومنہ سوچنے لگی کیا اس بیٹھکے میں بھی یہی ہوا کرتا ہوگا؟ اس سوال میں اور اس یاد میں کچھ اتنا زور تھا کہ وہ مومنہ کو ڈھکیل کر بیٹھکے کے اندر لے گیا۔ یہاں پہنچتے ہی اس کی نگاہ ایک ایسی چیز پر پڑ گئی جس کے لئے صبح سے اس کا جوڑ جوڑ ٹلک رہا تھا۔ بیٹھکے کے اندر کچھ چنے اس طرح بکھرے ہوئے پڑے تھے جیسے پھوہڑپن سے رکھنے اٹھانے سے اناج بکھر جاتا ہے۔ لیکن بارش کی بوچھار اور نمی سے ان میں اکھوے پھوٹ آئے تھے۔ مومنہ

ان چنوں پر اس طرح ٹوٹ پڑی جیسے بھوکی مرغیاں دانے پر گرتی ہیں اور ان کو چن چن کر کھانے لگی۔ کھاتی جاتی تھی اور سوچتی جاتی تھی کہ الکھو اچھوٹے چنے بھی مزے کے ہوتے ہیں۔ نہ نمک، نہ مرچ۔ مگر کیسے سوندھے معلوم ہو رہے ہیں۔ سچ ہے کہ بھوک میں ہر چیز مزا دیتی ہے۔

چنے کھاتے کھاتے مومنہ کی نظر بیٹھکے اور گھر کے درمیانی دروازے پر پڑی اور کچھ دیکھ کر وہ اچھل پڑی۔ ایک کتیا کھڑی بہت غور سے مومنہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مومنہ پہلے تو ڈری کہ کہیں یہ مجھ پر حملہ نہ کردے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں خونخواری نہ پاکر چمکارا۔ کتیا دم ہلانے لگی۔ اس نے پھر چمکارا۔ پھر تو کتیا کوں کوں کرتی ہوئی دوڑی اور مومنہ کے پاؤں پر لوٹنے لگی اور اس کے گرد تصدق ہونے لگی۔ اس کی بے تاب محبت دیکھ کر مومنہ کو سرور سا آنے لگا۔ اوہ کتنے دنوں کے بعد محبت ملی ہے۔ اس نے کتیا کو چمٹا لیا۔ گویا بہت دنوں کے بچھڑے ہوئے اچانک مل گئے ہیں۔ چمٹانے کے بعد مومنہ کو خیال آیا کہ کتا نجس ہوتا ہے۔

جب پیار ہو چکا تو کتیا اندر بھاگ گئی۔ دم بھر میں واپس آکر مومنہ کے قدموں پر لوٹنے لگی اور پھر اندر بھاگ گئی۔ اور پھر باہر آکر قدموں پر لوٹنے لگی۔ مومنہ سمجھ گئی کہ یہ مجھے اندر لے جانا چاہتی ہے۔ وہ اسی مکان میں رات بسر کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس کا کچھ ارادہ ہو رہا تھا کہ اندر کا ایک جائزہ لے لوں۔ کتیا کے بلاوا دینے سے وہ نڈر ہو گئی اور اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی۔ مکان سادہ سا بنا ہوا تھا۔ بیٹھکے کے

پیچھے دالان تھا اور بغل میں ایک چھوٹا سا کمرہ۔ مکان کا سامنے کا حصہ تو جل گیا تھا، پر آگ صحن پار کر کے اس طرف نہیں آئی تھی۔ یہ ہوا کی مہربانی ہو یا بارش کی۔

کنیا کمرے کی طرف مڑی۔ مومنہ نے جیسے ہی ادھر دیکھا اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اور منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ لیکن اس نے فوراً ہی اپنے کو سنبھال لیا۔ ڈر کی کوئی بات نہ تھی اس کے سامنے صرف ایک چھوٹا سا دبلا پتلا حقیر سا ننگا مادر زاد لڑکا تھا۔

لڑکے کا ایک پہلو، ایک بازو۔ سینہ اور سر اور شاید دونوں آنکھیں آگ نے چاٹ لی تھیں ان زخموں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اور ان پر مکھیوں کے جھنڈ بھنک رہے تھے جن کو لڑکا کراہ کراہ کر نحیف ہاتھوں سے اُڑا رہا تھا۔

لڑکا پرنالے کے نیچے کے گڈھے کو ٹٹول رہا تھا۔ شاید پانی کی تلاش میں تھا۔ جب وہ نہیں ملا تو اس کے منہ سے ہائے ماں نکل گیا اور پھر وہ ہاتھوں اور کوھلوں کے بل گھسٹتا ہوا کمرے کے اندر گیا اور زمین پر کروٹ سے لیٹ گیا۔ اس لڑکے کے علاوہ گھر میں کوئی انسان نہ تھا۔ اور نہ کسی قسم کا ساز و سامان یہاں تک کہ پینے کے پانی کے لئے ایک برتن بھی نہ تھا۔

کنیا جوش میں لڑکے کے پاؤں چاٹنے لگی۔ لڑکا کراہ کر بولا۔

"کیا بات ہے آشا تو بھی بھوکی پیاسی ہو گی"۔

مومنہ کے خوف کی جگہ ترس نے لے لی۔ اور پھر ترس "ہائے ماں" سن کر ممتا بن گیا۔ ہائے یہ ننھا سا اپاہج بچہ اس اندھیر نگری میں بالکل

ہی اکیلا ہے بچارا!! سوائے آشا بے زبان کے کوئی پوچھنے والا تک نہیں۔ کوئی دو بوند پانی دینے والا تک نہیں۔ بچارا پرنالے کے نیچے کے گڈھے میں پانی ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک بوند بھی نہ ملا۔

مومنہ کی آنکھیں مامتا سے نم ہو گئیں اور وہ دبے پاؤں ذرا اور قریب چلی گئی، آشا خوشی سے اچھلنے لگی۔

لڑکے نے کراہ کر کہا 'ہے رام'

ہے رام سنتے ہی مامتا پر بجلی گر پڑی۔ اور اس نے شعلۂ جوالہ بن کر مومنہ کے تن بدن کو پھونک دیا۔

یہ تو ہندو ہے ہندو، پھر تو یقیناً اس پر خدا کا قہر ٹوٹا ہے۔ ان کم بختوں نے کس بے دردی سے میری ہنستی کھیلتی لاڈلی کو اٹھا کر ٹیکا ہے اور اس پر قہقہہ لگایا ہے۔ ہائے ان بچاروں کا زندہ کنوئیں میں اپنے بیٹوں کی لاشوں سے دبا دیا جانا!! اُف! نہ جانے کتنے دنوں میں جان نکلی ہو گی۔ میرے پیارے شمس و قمر، ان کا چیخ مار کر اماں پکارنا بدنصیب مہرن۔ خدا جانے زندہ بھی ہے اور اگر زندہ ہے تو اس کی کیسی کٹ رہی ہے، ہائے کیسے کیسے داغ ہیں میرے دل پر۔ یہ ظالم پاپی ہندو تو اس قابل ہیں کہ ان کا ایک ایک بچہ اسی طرح سسکا سسکا کر مارا جائے اور مرتے وقت بھی ایک بوند پانی نہ دیا جائے۔

مومنہ نے تھوڑی دیر لڑکے کے کراہنے اور تڑپنے کا سکون بخش نظارہ دیکھا اور پھر وہ جس طرح دبے پاؤں آئی تھی اسی طرح دبے پاؤں باہر چلی۔ اس کے منہ موڑتے ہی پھر سخت تعفن کا جھونکا آیا جس

سے اس کی روح تلملا گئی۔

بچے کی ننھا آس آتما مومنہ کی طرف حسرت سے دیکھنے لگی۔ اور اس کے قدموں پر لوٹنے لگی۔ لیکن مومنہ کے لوٹتے ہوئے قدموں میں برک نہ لگا سکی۔

بیٹھکے میں آکر مومنہ چنے سمیٹ کر آنچل میں بھرنے لگی۔ اس وقت اس کی نظر ایک اونچے طاق پر پڑی جس میں سونڈ والے دیوتا کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گھر ہی ہندو کا ہے ایک ہندو کے گھر میں پناہ لینے سے اس درخت کے نیچے زندگی کاٹنا لاکھ درجے بہتر ہے جہاں میری بھڑ رہتی ہے۔

(۵)

دھوپ کی تیزی جا چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے بڑے بڑے سفید ٹکڑے سکون سے ایک طرف سے دوسری طرف جا رہے تھے۔ خوش گوار ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکے تھکے ہوئے بدن کو سہلا رہے تھے۔ درخت کے نیچے غوغائیاں شور مچا رہی تھیں اور آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں، مومنہ اپنے درخت سے کچھ دور ایک تلیا کے پاس بیٹھی اکھوا پھوٹے چنوں کو دھو دھو کر کھا رہی تھی اور غوغائیوں کے بچکانے شور سے لطف اٹھا رہی تھی۔ اس کے دل میں آج کتنے دنوں کے بعد مسرت کی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ مومنہ دل میں کہہ رہی تھی دیکھ شک بھرے دل دیکھ۔ خدا کے یہاں دیر ہے۔ اندھیر نہیں۔ دیکھ سامنے کا گاؤں کس طرح جل کر کھنڈر بن گیا ہے۔ اور اس کے بسنے والوں کو جبری دیس نکالا ملا ہے۔ ایک

بچہ جو سب کے پاپوں کو بھوگنے کے لیے رہ گیا ہے کس طرح سسک سسک کر مر رہا ہے۔ یہ خدا کا قہر نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں۔ اوارحم الراحمین۔ تو نے مجھ دکھیاری کے شوہر اور بچوں کی آہوں کو رائیگاں نہیں جانے دیا۔

مومنہ چنے کھا رہی تھی اور اپنے تصور کی آنکھوں سے سسکتے ہوئے بچے کا تڑپنا، ایڑیاں رگڑنا۔ اور سکرات میں مبتلا ہو کر آنکھوں آنکھوں میں در و دیوار سے پانی مانگنا، دیکھ رہی تھی کیوں رے ہندو، اب محسوس کیا تو نے کہ میری لاڈلی کی جان کس طرح نکلی ہو گی اب جانا کہ قتل کرنا اور وہ بھی، بچوں کو ماں کے سامنے اور شوہر کو بیوی کے سامنے۔ عصمت دری کرنا اور وہ بھی بیٹی کے سامنے، یہ کیسے پاپ ہیں اور اس دنیا کا پالن ہار اس کی سزا کیسی بھیانک دیتا ہے۔

اس منظر سے مومنہ کو کچھ ایسی لذت مل رہی تھی کہ درجنوں بار تکرار کے باوجود جی نہیں بھرا تھا بلکہ جی میں تو یہ موجیں اٹھ رہی تھیں کہ کاش اسی تصور کی تانوں اور کنگری میں ساری زندگی بیت جائے۔

ظالم آسمان تو ذرا دیر بھی کسی کو ہنستے کھیلتے نہیں دیکھ سکتا ہے۔ مومنہ ان خیالوں سے لطف لے رہی تھی کہ وہ چاروں طرف سے گھر آیا۔ اور کڑک اور گرج سے اس نے دنیا کو بھر دیا۔ مومنہ کے خیالات کی پرواز رک گئی۔ اور وہ سوچنے لگی کہ میں کہاں جاؤں کہ رات بلا بھیگے کٹ جائے۔ ایک رات بھیگ چکنے کے بعد اب اس میں پھر اس مصیبت کے جھیلنے کی بالکل ہمت نہ تھی۔ دوسری طرف اسے مہرن یاد آنے لگی

تھی۔ خدا جانے کس حال میں ہو اور کیسے ظالموں سے سابقہ پڑا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بیمار ہو گئی ہو۔ اور اس کے خوشہ چینیوں نے بھی اس کے ساتھ وہی سلوک کیا ہو جو کینزن کے ساتھ بے رحموں نے کیا تھا کہ جب بہت بیمار ہو گئی تو اسے کہیں پھکوا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ مہرن اس حالت میں ہو اور میں اس کی مدد کر سکوں۔ مومنہ ان خیالات کو ڈراوے کی شکل میں دیکھنے لگی کہ مہرن بیمار ہے۔ بے گھر ہے کہ ایکا ایکی میں پہنچ جاتی ہوں، اور اس کی مدد کرتی ہوں اور سوچنے لگی کہ میری جان مہرن کے لئے بہت قیمتی ہے اس لئے اس کی حفاظت ضروری ہے۔

ساتھ ساتھ ایک بات اور بھی تھی وہ یہ کہ وہ ڈر رہی تھی۔ تھی تو وہ بہادر اور بہادر دادا اور بہادر باپ کی اولاد۔ ایک بار چوروں کو بھی بھگا چکی تھی لیکن دل مضبوط ہونے پر ملائم کنارے رکھتا تھا۔ اور اس وقت چھوٹے چھوٹے بہت سے خوفوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ رات کا خوف، جنگل کا خوف۔ درندوں کا خوف، سانپ بچھو کا خوف، چوروں، ڈاکوؤں کا خوف، شرپسند کا خوف، بھیگ کر بیمار ہونے اور پھر تنہا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کا خوف۔ یہ سب خوف مہرن کے لئے زندہ رہنے کی تمنا میں گڈمڈ ہو کر ایک گھبراہٹ میں تبدیل ہو گئے تھے کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔

مومنہ نے فیصلہ کر لیا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ یہ فیصلہ اس نے کسی منطق سے نہیں کیا، بلکہ اسی طرح کیا جس طرح اس نے کلوٹے کے گھر سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یعنی دو سمتوں میں سے جو سمت جذبات کے لئے زیادہ پرکشش ہوتی وہ مومنہ کو کھینچ لے گئی۔

مومنہ پگ ڈنڈی چھوڑ کر کھیتوں کھیتوں ہوتی ہوئی آشا کے گھر کی طرف چلی وہاں چھت تھی جو بارش کو روکے گی۔ دروازے تھے جو بند ہو جائیں گے۔ اور آشا تھی جو وقت پڑنے پر ضرور کام آئے گی۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ جب ہندوؤں نے میرے باپ دادا کے گھر پر قبضہ کر لیا ہے تو میں کیوں نہ ان کے گھر پر قبضہ کر لوں؟ ضرور کروں گی۔ آشا کا گھر میرا گھر ہے، ہاں میرا گھر۔

مومنہ اپنے گھر پہنچ گئی اور بیٹھکے میں جا کر اس نے جلدی جلدی سب دروازے بند کر لئے۔ اب وہ شب کے حملہ آوروں سے بھی محفوظ تھی اور آشا کی نظروں سے بھی، وہ آشا سے اور آشا اس سے محبت کرتی تھی۔ لیکن پھر بھی مومنہ آشا کی نظروں سے ڈرتی تھی، وہ ان کی التجا نہیں برداشت کر سکتی تھی۔

مومنہ خیریت سے اپنے گھر پہنچ گئی۔ اپنا گھر، ہاں، اب یہ اپنا گھر تو ہے ہی۔ میں یہاں کی گھر والی ہوں۔ مہرن آئے گی تو اسے بھی یہیں رکھوں گی۔ بیٹھکے، دالان اور کمرے کو میں صاف کر لوں گی۔ پھر دیکھا جائے گا۔ ضروریات زندگی کا کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔ اگر مجھے کوئی شخص یہاں سے نکالے گا بھی تو بھی میں نہیں نکلوں گی، کہوں گی کہ پہلے تم میرا مکان مجھے دلا دو۔ تب اسے مانگنا۔ کسی کو کیا حق تھا میرے باپ دادا کے گھر کو مجھ سے چھین لینے کا۔

رات آگئی، سیاہ ہوا ہوا پکار نے لگے۔ ذرا رات گزری تھی کہ ان کے ساتھ دوسرے جانوروں کی چیخیں بھی شامل ہو گئیں۔ مومنہ کے دماغ پر سینما کے پردے کی طرح ہیبت ناک مناظر گزر رہے تھے۔ کبھی وہ

یہ دیکھتی کہ میں اپنے مکان میں ہوں اور ابا میاں گھبرائے ہوئے اندر آرہے ہیں اور حملہ ہو رہا ہے اور میری لاڈلی ماری جا رہی ہے اور کبھی یہ کہ میں اپنے نئے مکان میں ہوں اور مجاہدین اسلام کا حملہ ہو رہا ہے۔ ہندو لڑکے کے دادا نے گھر کو چاروں طرف سے بند کر کے مقابلہ کرنا چاہا، لیکن اسلامی جوش اور اللہ اکبر کے نعروں کے سامنے وہ شکست کھا گئے اور مجاہدین اندر گھس آئے اور دروازے پر انہوں نے لڑکے کے دادا کو مارا۔ پھر مومنہ کو ایسا محسوس ہوا کہ میں خود بھی حملہ آوروں کے ساتھ ہوں، مجاہدوں نے عورتوں کو کھینچ کھینچ کر گھر سے باہر نکالا، لڑکے کی دودھ پیتی بہن کو ماں کی گود سے چھین کر پٹک دیا۔ پھر اس کی بہن اور اس کی ماں کی عصمت .....

مومنہ خواب میں بھی یہی سب کچھ دیکھتی رہی۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ لاڈلی پٹک دینے سے مری نہیں ہے بلکہ ایک تنہا کمرے میں پڑی سسک رہی ہے اور کوئی اسے دو بوند پانی تک نہیں دیتا ہے۔ ایک بار خواب میں اس کی آنکھیں آشا کی آنکھوں سے مل گئیں اور یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے ہو گیا کہ آشا کی پلکوں کے بیچ میں شمس کی آنکھیں ہیں۔ اُفوہ وہ کس حسرت سے میری طرف تاک رہا ہے!! ہائے میں اسے ظالموں سے کیسے چھڑاؤں، وہ دیکھو شمس کی آنکھیں پیاسی ہیں اور دو بوند پانی کے لئے تڑپ رہی ہیں۔

پھر مومنہ کو ایسا نظر آیا کہ مہرن بھاگی چلی آرہی ہے اور اس کے پیچھے بہت سے لوگ پکڑنے کے لئے دوڑ رہے ہیں۔ مہرن چلا رہی ہے بچاؤ بچاؤ مگر لیکن کوئی مدد کو نہیں آتا۔ بھاگتے بھاگتے مہرن ٹھٹھکے کے

دروازے پر آگئی اور التجائیں کرنے لگی۔

"اماں دروازہ کھول دو۔ اماں، اماں، میری اماں، مجھے اندر لے لو، اماں جلدی کرو ورنہ وہ لوگ آجائیں گے۔ اماں۔ میری اماں خدا کے لئے......"

مومنہ کے ہاتھ اور پاؤں اور زبان سے جیسے کسی نے جان نکال لی ہے۔ ان میں کسی قسم کی سکت نہیں۔ نہ وہ ہل سکتی ہے، نہ بول سکتی ہے سخت بے بسی کے عالم میں ہرن کی آواز سنتی رہی۔

ذرا دیر میں جب مومنہ کے حواس بجا ہوئے تو اسے پتہ چلا کہ باہر کے دروازے پر ہرن نہیں آشا ہے جو چوکھٹ سے اپنا سر رگڑ رہی ہے۔ اور التجائیں کر رہی ہے کہ مرتے ہوئے بچے کے حلق میں دو بوند پانی ٹپکا دو۔ ساتھ ساتھ مکان کے اندر سے کراہنے کی خفیف آواز آرہی ہے۔

"ماں۔ ہے ماں۔ ماں۔ پانی۔ ایک بوند پانی۔ ہے رام۔ ماں۔ ماں ماں۔ میں چلا۔ ماں۔ ایک بوند۔ ہائے ماں۔ تم کہاں ہو ماں۔"

کنواڑوں کی درازوں سے چاند کی میٹھی کرنیں آرہی تھیں اور ہوا کے خوش گوار جھونکے بھی۔ یعنی گھٹا چھٹ گئی تھی اور اب آسمان صاف تھا۔ مومنہ نے کنواڑ کھولا اور اس کے کھلتے ہی آشا اندر آ کر مومنہ کے پاؤں پر لوٹنے لگی۔ اور التجائیں کرنے لگی۔ اس کے لوٹنے میں التجا تھی اس کے لیٹ کر دونوں ہاتھوں کو اس کی طرف پھیلانے میں التجا تھی۔ اس کی بھیک منگی نظروں میں التجا تھی۔

مومنہ نے چمکار کر آشا کو اپنے ساتھ لیا اور مٹی کے برتن کا ایک بڑا

سا لگڑا لے کر تلیا تک گئی ۔ اس کے پانی میں اس وقت چاند ستاروں کا عکس پڑ رہا تھا۔ جب مومنہ جھک کر پانی بھرنے لگی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس قتل و غارت کی دنیا سے نکل کر ایسی دنیا میں آگئی ہوں جہاں اوپر بھی چاند ستارے ہیں اور نیچے بھی چاند ستارے ۔

مومنہ پانی لے کر ایسی احتیاط سے واپس چلی کہ اس نے جو کچھ ٹوٹے برتن میں چاند ستاروں کی چھاؤں میں بھر لیا ہے وہ چھلک نہ جائے اس کے آگے انجاؤں بھری آشا تھی۔ گھر آتے ہی وہ مومنہ سے پہلے لڑکے کے پاس پہنچکر خوشی سے بھونکنے اور اچھلنے لگی اور لڑکے کے پاؤں چاٹنے لگی ۔

"کیا بات ہے آشا؟ کیوں اتنی خوش ہے؟" ـــــ "ہائے ماں"! مومنہ نے قریب جا کر پکارا ۔

"بیٹا !"

بچے نے نہیں سنا ۔ مومنہ سمجھ گئی کہ آگ نے جہاں اس کی آنکھیں جلا دی ہیں وہاں کان بھی خراب کر دیئے ہیں ۔ اب کی اس نے زور سے پکارا ۔

"بیٹا !"

لڑکا اچھل پڑا اور اپنی خالی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا ۔ مومنہ نے ڈھارس دینے والی آواز سے پکارا ۔

"بیٹا !"

"کون ؟"

اس کی آواز میں ڈر بھی تھا اور حیرت بھی ۔ مومنہ نے اور پاس

جاکر کہا۔
"بیٹا"!
بچہ پھر اچھل پڑا۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولا۔
"کون! ماں؟ ——"
"ہاں بیٹا۔"
"ماں!"
"ہاں۔ ہاں بیٹا۔ میں ہوں۔"
"ماں!! تم!!"
"ہاں ہاں بیٹا میں ہوں۔"
"ماں!!!
مومنہ نے لڑکے کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا۔
"بیٹا!"
"ماں۔ کیا تم مسلمان سے بچ کر آگئیں؟"
"ہاں بیٹا میں بھاگ آئی۔"
"ماں۔ ماں۔ ماں۔ ماں۔ ماں ——"
بچہ مومنہ کے گلے میں باہیں ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مومنہ کی آنکھوں سے جو شوہر اور بچوں کی موت کے دن سے لے کر آج تک آنسو کی ایک بوند کو ترستی رہی تھیں، آبشار پھوٹ نکلا۔ وہ آنچل سے بچے کا زخم بچا کر اس کے آنسو پوچھتی اور پھر اپنے۔ جب ذرا دل ہلکا ہو گیا تو مومنہ بچے کو ڈھارس دینے لگی۔
"بیٹا اب نہ رو۔ اب تو میں آگئی ہوں۔"

لڑکا ہچکیاں لیتے ہوئے کہنے لگا۔

"ماں پانی"

مومنہ "لو بیٹا"

مومنہ لڑکے کو گود میں بٹھا کر پانی پلانے لگی اور وہ بدحواسی سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ اس وقت مومنہ نے محسوس کیا کہ لڑکے کو خاصا تیز بخار ہے۔ جب پانی پی چکا تو کہنے لگا۔

"ماں"

"ہاں بیٹا"

"اندھا ہو گیا ہوں اور شاید بہرا بھی۔ کسی بات کی خبر نہیں ہوتی ماں میرا اب کیا ہو گا؟"

بچہ پھر رونے لگا۔ مومنہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ سمجھا کر کہنے لگی۔

"بیٹا گھبراؤ نہیں اچھے ہو جاؤ گے"

مومنہ نے بچے کی پیشانی پر پیار کیا۔ بچہ کھٹک کر بولا۔

"ماں تم مجھے رامو کیوں نہیں کہتیں؟"

"کہتی تو ہوں۔ رامو۔ رامو بیٹا۔ میرا پیارا رامو"۔

"تمہاری آواز اور تمہاری باتیں کچھ بدلی بدلی معلوم ہوتی ہیں میں جل گیا ہوں اس وجہ سے شاید ایسا معلوم ہوتا ہو گا۔ کیوں ماں"

آخری جملے میں بچے نے جو سوال کیا تھا اس کی مخاطب مومنہ اتنی نہ تھی جتنا اس کا اپنا دل۔

"بیٹا میں نے بہت تکلیفیں جھیلی ہیں"

"ہائے ماں۔ تم کو مسلمانوں نے بہت دکھ پہنچایا؟ کیا مارا؟ جلایا تو نہیں؟"

"بیٹا اب ان باتوں کو... نہ یاد دلاؤ۔ جب تم اچھے ہو جاؤ گے تب میں خود بتا دوں گی۔"

"اچھا ماں۔ تم کو ان باتوں کو یاد کر کے بہت دکھ ہوتا ہوگا ہائے ماں تم نے ابھی یہاں جلے پر ہاتھ رکھ دیا تھا تو جان نکل گئی۔"

"بچ بچ۔ میرا پیارا رامو۔ اب میں خیال رکھوں گی۔ گھبراؤ نہیں میں آگئی ہوں اب تو اچھا ہو جائے گا۔"

آشا برابر ان دونوں کے گرد خوشی سے ناچ رہی تھی۔ رامو کے کان میں اس کی آواز کی بھنک پہنچی تو بولا۔

ماں۔ آشا کو بھی پیار کر لو۔ اس نے میری بڑی خبر لی ہے۔ مجھے لاش کھانے والے جنگلی جانوروں سے جو رات کو گاؤں میں گھومتے رہتے ہیں۔ بچایا ہے۔"

مومنہ نے آشا کو چمٹا لیا اور کہنے لگی۔

"آشا تو نے میرے بچے کی حفاظت کی ہے۔ تو میری بیٹی کے برابر ہے۔"

آشا اپنی تعریف سن کر اترانے لگی۔

رامو۔ "مسلمانوں سے تو یہ کتنا اچھی۔ اس کے دل میں دیا تو ہے۔"

مومنہ کے دل پر ایک برچھی لگی۔ لیکن وہ ضبط کر کے بولی۔

"ہاں بیٹا۔"

رامو ماں کی گود میں کھسک کر لیٹ گیا۔ ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔

"ماں!"

"ہاں رامو!"

"میری آنکھیں اچھی ہو جائیں گی؟"

"ہاں بیٹا ضرور اچھی ہو جائیں گی۔"

"اور کان!"

"وہ بھی!"

رامو خوش ہو کر ماں کے گلے میں باہیں ڈال کر بولا۔

"ماں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اچھا ہو جاؤں گا!"

"ہاں میرے چاند۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اچھا ہو جائے گا!"

رامو اس طرح چونک پڑا جیسے اس کے گولی لگ گئی۔ اس نے اپنی باہیں کھینچ لیں اور مومنہ کے زانو سے سر اٹھا کر بولا۔

"ماں!!"

مومنہ (گھبرا کر) کیا بات ہے رامو؟ — کیا ہوا؟"

"تم! —"

"ہاں بیٹا۔ کہو نا!"

"تم اللہ کہتی ہو!"

بچہ بہت سہما ہوا تھا۔ اور اپنی خالی آنکھوں سے مومنہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ گویا ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ میری ماں نہ ہو۔ بلکہ کوئی مسلمان ہو۔ مومنہ کے دل پر یہ دوسری برچھی لگی لیکن اس نے پھر ضبط کر کے رامو کا سر اپنی گود میں کھینچ لیا۔ اس کے

ہاتھ اپنے گلے میں حمائل کر لیئے۔ اور بولی۔

"بیٹا مجھے اتنے دنوں مسلمانوں میں جو رہنا پڑا ہے"

راموں نے کچھ سوچا اور پھر کہنے لگا۔

"وہ لوگ تم سے زبردستی اللہ اللہ کہلو لیتے ہوں گے۔ اس کے لئے مارتے ہوں گے"

یہ بات راموں نے سوال کے طور پر نہیں، اپنے کو اطمینان دلانے کے لئے کہی تھی اور وہ مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ اس کے نزدیک مسلمانوں کے مظالم ہر تبدیلی کو ممکن بنا سکتے تھے۔

مومنہ "ہاں بیٹا۔ لیکن اب ان باتوں کو نہ پوچھو"۔

راموں۔ "اماں جب میں اللہ اکبر کی پکاروں کو یاد کرتا ہوں تو ـــ"

بچہ سہمنے لگا اور اس کے گلے میں پھانسی سی لگنے لگی۔ مومنہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا:-

"تم بھی ان باتوں کو بھول جاؤ"۔

راموں ذرا دیر کچھ سوچتا رہا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"ماں"

"راموں"

"سچ بتاؤ تم میری ماں ہو؟"

"اور کون تجھے اس طرح پیار کر سکتا ہے بیٹا"

"سچ ہے۔ جانے کیا بات ہے مجھے شک ہوتا ہے"

"شک نہ کرو بیٹا۔"

راموں پھر ذرا دیر کے بعد پوچھنے لگا۔

"کہیں یہ سپنا تو نہیں؟"

"نہیں بیٹا۔"

"ایسا تو نہیں کہ جب صبح ہو تو تم نہ ملو۔"

بچے کے دل میں واقعی ڈر پیدا ہو چلا تھا اور اس نے مومنہ کو اس طرح ٹٹولا کہ کہیں وہ وہم تو نہیں ہے۔

"نہیں نہیں بیٹا ایسا نہیں ہوگا۔ دیکھ تیری آشا بھی تو تجھے دیکھ رہی ہے۔"

راموکی باہیں زیادہ مضبوطی سے مومنہ کے گرد جھپٹ گئیں۔

"ہاں میرا من بھی اندر سے یہی کہہ رہا ہے کہ تم میری ماں ہو اور اب سچ مچ آگئی ہو، مجھے رامو رامو کہو۔"

"میرا رامو، میرا اچھا رامو، میرا پیارا رامو......"

رامو زخموں کو سنبھال کر ماں کی گود میں سمٹ آیا اور فوراً غافل سوگیا۔ مومنہ کو ایسا محسوس ہونے لگا گویا اس بچے کو گود لے کر میرے زخم ہرے ہوگئے ہیں، دل ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے اور بچے کو کلیجے سے لگاکر دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہ رہا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ ایک بے سہارے کو سہارا دینے سے اپنی زندگی بے سہارے نہ رہی۔

دراصل مومنہ اپنے جذبات سمجھنے سے بالکل قاصر تھی۔ اس وقت سے قاصر تھی جب سے وہ سوکر اٹھی ہے۔ اور سیدھی بچے کے پاس چلی آئی ہے۔ میرے اندر آخر کیا الٹ پلٹ ہوگیا جو میں نے اس ہندو بچے کو نفرت کرتے کرتے کلیجے سے لگا لیا۔ ایک ہندو سے اتنی محبت کرنا کوئی

بری بات تو نہیں؛ لیکن اس کو اندر سے اس بات کا یقین ضرور تھا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔

پو پھٹی اور صبح کی روشنی ہر طرف پھیلنے لگی، مومنہ نے دلارے رامو کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ کتنا بھولا اور کتنا مظلوم ہے! ذرا خنکی ہو رہی تھی اس لئے مومنہ نے رامو کو اپنا دوپٹہ دوہرا کر کے اڑھا دیا۔ اور ہلکے سے اس کے ماتھے پر پیار کر کے دل میں یہ عہد کر لیا کہ یہ میرا شمس اور میرا قمر ہے اور میں اس کو اسی طرح پالوں گی۔

(۶)

دن چڑھے جب رامو کی آنکھ کھلی تو مومنہ نے اپنا دوپٹہ تر کر کے اس کا منہ اور بدن جو جھوٹے برتنوں کی طرح گھنونے ہو رہے تھے صاف کئے۔ پھر جتنا اس سے ہو سکا اور رامو برداشت کر سکا زخموں کو صاف کیا اور پھر اسے ضروریات سے فراغت کرائی۔ ان کاموں میں اس نے کسی قسم کی گھن نہیں محسوس کی۔ اپنی اولاد کا گو موت کرنے میں گھن کیسی؟

ان باتوں سے فارغ ہو کر رامو کہنے لگا۔

"جس دن گاؤں لٹا ہے میں اس دن کا کھایا ہوا ہوں۔ تب سے سوائے اس برساتی پانی کے جو پرنالے کے نیچے گڈھے میں جمع ہو جاتا تھا، میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا ہے۔ شاید چھ روز ہوئے مجھے کھانا کھائے۔"

مومنہ نے ذرا خوش ہو کر پوچھا۔

"تم نے کیسے پہچانا کہ چھ دن ہوئے؟ کیا اتنا نظر آجاتا ہے؟"

"رات کو لاشوں کو کھانے کے لیئے جو جانور آتے ہیں وہ آپس میں لڑتے ہیں، چیختے ہیں اور شور مچاتے ہیں، ان کے آنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ رات ہو گئی۔ اور جانے سے یہ کہ دن ہو گیا۔"

مومنہ اس خوفناک گھڑیال کا حال سن کر لرز گئی۔

راموا تنا بھوکا تھا لیکن اس پر بھی اسے گوارا نہ تھا کہ ماں پاس سے چلی جائے۔ مومنہ اسے بہت سمجھا بجھا کر اور ڈھارس دے کر غذا کی تلاش میں نکلی۔ بخار میں بھنتے ہوئے چھ دن کے فاقہ زدہ بچے کو چنے دینا تو اسے موت کے منہ میں جھونک دینا ہے پھر اور کیا دیا جائے، آگ تک تو میسر نہیں جو چنوں کو ٹھیکروں میں ابال ہی لیا جائے۔ مومنہ کو جو کچھ امید تھی ایک آواز سے تھی جسے وہ کل کئی بار سن چکی تھی۔ اور آج صبح پھر سنی تھی۔ اور اس وقت کچھ اندازہ بھی کر لیا تھا کہ وہ کس طرف سے آرہی ہے۔ اس وقت در اصل اسی آواز کی تلاش میں نکلی تھی۔ وہ مل جائے تو راموں کی غذا کا بلکہ خود اس کی غذا کا بھی انتظام ہو جائے شاید۔

مومنہ اپنے مکان کے پچھواڑے کی طرف چلی۔ چند جلے ہوئے گھر ملے اور ان سے نکل کر گاؤں کی حد آگئی۔ گاؤں چھوٹا سا تھا۔ سرحد پر پہنچکر اس نے وہ بھیانک منظر دیکھا ہے اور ناک میں ایسی سخت تعفن آئی ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اور اپنی جگہ پر بت بن کر رہ گئی۔ چند کچے گھروں سے متصل ایک چھوٹا ہوا میدان تھا۔ جس میں جلے ہوئے کندے اور جلے ہوئے انسانی ہاتھ پاؤں سر اور سینے کے ڈھانچے ڈھیر تھے۔ ان میں سے کچھ تو مردہ خور جانوروں کی مہربانی سے بالکل صاف

ہو چکے تھے اور کچھ پر بھنے ہوئے گوشت کے ریشے لگے رہ گئے تھے۔ جن کو اس وقت کوے، گدھ، اور آوارہ کتے ذوق اور شوق سے صاف کر رہے تھے۔ بیس چالیس کھوپڑیاں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی اپنی آنکھوں کے حلقوں سے مومنہ کی طرف تک رہی تھیں، اُف ان میں جینے کی کتنی حسرت تھی۔

میدان دو طرف سے گھروں سے گھرا ہوا تھا اور ان کی دیواروں پر کوئلہ رگڑ رگڑ کر بہت جلی لکھا ہوا تھا۔ اللہ اکبر۔ ظاہر تھا کہ مجاہدین اسلام نے اللہ کی شان اونچی کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا۔ مومنہ کی ناک میں رہ رہ کر جو سخت تعفن آ رہی تھی اس کا سونا ہی تھا۔

مومنہ نے ادھر چند دنوں کے اندر قتل و خون اور آتش زنی کے اتنے مناظر دیکھے اور سنے تھے اور اپنے پیاروں کو آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا کہ وہ تجربے کار فوجی کی طرح لاشوں کی عادی سی ہو گئی تھی۔ لیکن اتنا عادی ہونے پر بھی اس منظر نے اس کو دہلا دیا۔

مومنہ کو ایک کنواں بھی یاد آ گیا۔ جس میں اس کے شوہر، بچوں اور سارے خاندان کی لاشیں تھیں۔

مومنہ ابھی اس منظر کی دہشت سے پوری طرح نہیں نکل پائی تھی کہ اس نے دیکھا آشا جو اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی ایک ران کو سونگھ رہی ہے۔ ساتھ ساتھ زبان چاٹ رہی ہے اور بھونک بھونک کر مومنہ کی طرف دیکھ رہی ہے ــــ کیا آشا انسانی کباب کھانے کی اجازت مانگ رہی ہے؟

آشا کیوں نہ کھائے جب ان کو سینکڑوں جانوروں اور گدھوں نے کھایا ہے تو آشا کیوں نہ کھائے ؟

جب پیٹ بھروں نے کھایا ہے تو چھ دن کی بھوکی آشا کیوں نہ کھائے ؟

جب ایشور کے پجاری اور اسلامی مجاہد انسانی جسم کا احترام نہیں کرتے تو آشا کیوں کرے کیا آشا ان سے برتر ہے ؟

آشا لاش کو سونگھتی رہی اور مومنہ سے اجازت مانگتی رہی۔ لیکن جب ادھر سے کوئی شنوائی نہ ہوئی تو بادلِ ناخواستہ مومنہ کے پاس آکر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ گویا فریاد کر رہی تھی کہ جس کام کو سب کر رہے ہیں اس کے کرنے سے تم مجھے کیوں روکتی ہو ؟ یہ کیسا ظلم ہے ؟

مومنہ میں آگے جانے کی ہمت نہ تھی لیکن اس نے لاشوں کے پاس کے ایک گھر کے اندر سے وہی آواز سنی جس کی تلاش میں وہ آئی تھی۔ جو ماں اپنی تین اولادوں کو آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھ چکی ہو وہ چوتھی کے لیے جواب بھولی آنکھ کا دیدہ ہے۔ کیا نہ کر گزرے گی وہ ہمت کر کے چتا کے کنارے کنارے انسانی ہڈیوں کو بچاتی ہوئی آواز والے گھر تک پہنچ گئی۔

اس گھر کی چھتیں جل چکی تھیں صرف دیواریں کھڑی رہ گئی تھیں اور ان ہی کے اندر سے وہ آواز آئی تھی۔ دروازہ کے سامنے ملبہ کا ڈھیر تھا۔ اس لیے اندر جانا ناممکن تھا۔ مومنہ نے ملبے پر ہو کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ آشا آگے آگے چڑھنے لگی۔ اس کا سہارا مل گیا۔ اور مومنہ

اوپر پہنچ گئی۔ وہاں سے اس نے نیچے جھانکا۔
چار دیواری کے اندر تھوڑی سی جگہ تھی جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اور اس میں بھینس کا مردہ بچہ پھولا ہوا تیر رہا تھا۔ اس کے برابر زندہ بھینس پڑی ہوئی تھی جس کی کمر کو ایک بڑے شہتیر اور بہت سے ملبے نے ایسا دبا رکھا تھا کہ وہ ہل بھی نہ سکتی تھی۔ وہ کراہ رہی تھی اور اپنے بچے کو چاٹ رہی تھی۔ بھینس تو وہ مامتا بھری ماں ہوتی ہے جو اپنے بچے کی مہینوں کی سوکھی کھال تک کو چاٹتی ہے اور اس کے لئے بھی تھنوں میں دودھ ابل آتا ہے۔ بھینس نے مومنہ کو جو دیکھا تو بڑی فریادی آواز نکالی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ خدا کے لئے مجھے جلدی اس قید سے رہائی دو تاکہ اپنے بچے کو دودھ پلاؤں۔ غریب چھ روز سے بھوکا ہے۔
مومنہ حسرت سے بھینس کو دیکھتی رہی کہ چھ ہاتھ نیچے دودھ کی نہر موجود ہے لیکن بیکار۔ میری ایسی چار عورتیں بھی اس مظلوم کو آزاد نہیں کرا سکتی ہیں۔ ہائے میرے چھ دن کے بھوکے بچے کو اس کے دودھ کا ایک قطرہ بھی نہیں میسر آسکتا ہے۔
مومنہ شکستہ دل بھینس کے پھانسی گھر سے واپس ہوئی۔ در جنوں انسانی کھوپڑیاں بتیسی نکالے اس کی کوشش پر ہنس رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔
"مورکھ، ہم نے اپنے پیارے پیارے بچوں کو بچانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ خوشامدیں کیں۔ گڑگڑائے، ناک رگڑی۔ لیکن کیا حاصل ہوا۔ جاؤ تم اور اپنے بچے کو بھی اسی چتا میں لا کر رکھ دو۔"

جب مومنہ مسجد نما شوالے کے سامنے سے گذری تو وہ بے اختیار سجدے میں گر پڑی اور گڑ گڑا کر گڑگڑا کر دعا مانگنے لگی۔

"اے سب کے پیدا کرنے والے اس دنیا میں جو کچھ میرے پاس تھا سب جاتا رہا، گھربار، دھن دولت، عزیز و اقارب، شوہر، بچے، عزت ناموس۔ اب تو نے ایک اپاہج بیمار بچہ مجھے بخشا ہے جس نے میرے ویران دل کو باغ و بہار بنا دیا ہے۔ اس کے لئے کس زبان سے تیرا شکر ادا کروں میں اسے محنت مزدوری کر کے پالوں گی اور جب تک جیوں گی اس کی آنکھوں کا کام کروں گی اور اگر مرتے دم بھی بہن مل گئی تو اس کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہہ جاؤں گی کہ یہ میری امانت ہے۔ دیکھ چاہے تو تکلیف اٹھائیے لیکن اسے تکلیف نہ ہو۔"

"اے میرے مالک تو اب رامو کو مجھ سے نہ چھین۔ اگر میری جان کے بدلے بھی اس کی جان بچ سکتی ہو تو میں بابر کی طرح اسے شوق سے قربان کر دوں گی۔"

مومنہ کی آنکھوں سے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ اس نے اٹھ کر گود پھیلا کر کہا۔ "اے مالک تو بچے کے لئے کھانا اور دوا دے۔"

مومنہ کے جسم کی ایک ایک رگ، گوشت کا ایک ایک ریشہ جذبات کا ایک ایک سر مانتا بن گیا۔ وہ دیر تک یوں ہی دعا مانگتی رہی۔ اس سے دل کو ڈھارس ہوئی۔ اور خود اعتمادی واپس آ گئی۔

مومنہ کے آتے ہی رامو نے پوچھا۔

"ماں۔ کچھ ملا؟"

مومنہ نے کچھ جواب نہیں دیا۔
رامو۔ "کچھ نہیں ملا۔ کہاں سے ملتا سب کچھ تو مسلمان لے گئے!"
رامو نے شکستہ دلی اور مایوسی میں دو بار "ہے رام ہے رام" پکارا۔ مومنہ نے خاموشی سے راموکا سر زخموں کو بچاکر اپنی گود میں رکھ لیا۔
رامو۔ "اچھا ماں پانی ہی پلادے"
مومنہ نے دل میں بسم اللہ کہہ کر اپنی ایک چھاتی رامو کے منہ میں دے دی۔ رامو بے حد متحیر ہو کر بولا۔
"ماں!!!"
"بیٹا تو اسی پر پلا ہے۔ پی!"
"ماں"
"کوئی بات نہیں بیٹا۔ تیری جان مجھے بچانا ہے۔ پی۔ شاید چند قطرے تیرے نصیب سے اتر آئیں۔"
مومنہ کی مامتا ایسے جوش پر تھی کہ ایک دفعہ سوکھنے کے بعد پھر گنگا دنیا میں اتر آئی اور رامو کے پیٹ میں چند قطرے پہنچ گئے۔

(۷)

مومنہ کو رامو کی کٹی کٹی باتوں سے گاؤں کے اجڑنے کا جو حال معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ رامو اپنے بھائیوں۔ بہنوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اس کا باپ چلاتا ہوا گھر میں گھسا کہ گاؤں پر مسلمان حملہ کر رہے ہیں اس لئے سب جلدی سے بھاگ چلو۔ عورتیں چیخنے لگیں اور دوڑ دوڑ کر اپنے زیور اور کپڑے باندھنے لگیں۔ بچے رونے لگے۔ اور کام میں حارج ہونے لگے۔ مرد عورتوں کو پکڑ پکڑ کر کھینچنے لگے کہ سامان

کی پروانہ کرو۔ جلدی نکل بھاگو۔ رامو کی دادی چلانے لگی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنی سات پیڑھیوں کی کمائی چھوڑ کر بھاگ چلوں۔ یہ سب کچھ ہو ہی رہا تھا کہ حملہ آور بندوقیں لے کر آ گئے۔ بندوقیں وغیرہ۔ لاٹھیاں چلیں۔ دروازے توڑے گئے۔ اور بہت سے مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگاتے گھر میں گھس آئے۔

صدر دالان کی چھت کو کوئی زینہ نہیں جاتا تھا۔ لیکن رامو دیوار پر ہو کر کھپریل پر اور اس سے چھت پر چڑھ جاتا تھا۔ اور وہاں سے پتنگ اڑاتا تھا۔ جیسے ہی اس کے گھر میں حملہ آور گھسنے لگے وہ جلدی سے چھت پر چڑھ گیا۔ اور کھپریل کا جو حصہ چھت پر ٹکنے کے لئے اوپر اٹھا ہوا تھا اس کی آڑ میں چھپ کر لیٹ گیا۔ چھت اور کھپریل کے درمیان چوڑی سی دراز تھی اس سے کھپریل کے اندر کا اور کچھ باہر کا حال نظر آتا تھا۔ اس جگہ سے رامو نے دیکھا کہ کس طرح حملہ آوروں نے عورتوں کے زیور اور کپڑے اتار کر ان کو مادر زاد ننگا کیا۔ ان کی عصمت دری کی اور پھر پکڑ لے گئے۔ گھر کے مردوں اور بچوں میں سے بعض کو مارے جاتے ہوئے رامو نے اپنی آنکھ سے دیکھا اور بعض کی چیخیں سنیں۔

جب حملہ آور گھر کو لوٹ کر چلے گئے تو رامو نے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کے پچھواڑے چند گھروں کے پار زبردست آگ جل رہی تھی اور ادھر سے حملہ آوروں کے قہقہے اور مرنے والوں کی چیخیں آ رہی تھیں۔ ایک چھت پر نظر پڑی تو دیکھا کہ چار چھ آدمی ایک آدمی کے چاروں ہاتھ پاؤں پکڑے اس کو جھونک دے رہے ہیں اور وہ بے کسی سے چیخ رہا ہے۔ انھوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اسے الاؤ میں جھونک

دیا۔ جب وہ شعلوں کی لپیٹ میں آ رہا تھا تب راموں نے پہچانا کہ وہ میرے پتاجی ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ بیہوش ہو گیا۔

راموں کو جب ہوش آیا تو دیکھا کہ میں چاروں طرف سے شعلوں سے گھرا ہوا ہوں۔ کھپریل دھڑ دھڑ جل رہی ہے اور چھت دو جگہ سے جل کر نیچے گر چکی ہے۔ راموں منڈیر پر بھاگا لیکن ایک جگہ سے چھت گری تو اس کے ساتھ یہ بھی نیچے آگ میں جا گرا۔ لیکن ہمت کر کے اٹھا اور اٹھ کر اپنے کپڑوں کو جنہوں نے آگ پکڑ لی تھی پھینک کر بھاگا۔ اب اسے یاد نہیں کہ کس طرح اور کس طرف سے وہ صحن میں آ کر بیہوش ہو گیا۔

جب ہوش آیا ہے تو اسے پتہ چلا کہ میری دونوں آنکھیں جا چکی ہیں اور سارا بدن پھنکا جا رہا ہے۔ یہ بھنبھنے لگا۔ چند آدمی اس کے ارد گرد کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

"سسک سسک کر مرنے دو سالے کو۔ ایک گولی کیوں ضائع کرتے ہو؟"

"بہت ٹھیک۔ گھر کے دروازے کھلے چھوڑ جائیں تاکہ جنگلی جانوروں کو آنے میں زحمت نہ ہو۔"

دو تین قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ پھر کوئی ذرا متفکر لہجے میں بولا۔

"لیکن ہم کو معلوم کیسے ہوگا کہ یہ مر گیا؟"

"میں بتا دوں گا۔ بھلا یہ جی سکتا ہے؟"

کسی نے راموں کو ایک لات مار دی اور کہا۔

"بیٹا آرام سے موت کا انتظار کرو۔"

پھر سب چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی بارش ہونے لگی۔ اور راموں آشا

کے سہارے کمرے میں آگیا۔

رامو کو یہ واقعات بہت کٹے کٹے یاد تھے۔ اور بعض باتیں ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئی تھیں۔ مثلاً ماں کی بے آبروئی کے ساتھ وہ اپنے شیر خوار بھتیجے کا تذکرہ جوڑ دیتا۔ جس کے سر کو ایک حملہ آور نے ٹھوکر سے پاش پاش کر دیا تھا۔ جب بھتیجے کا تذکرہ کرتا تو گریہ کرتے ہوئے منہ سے کہنے لگتا کہ ماں تم کو بہت دکھ اٹھانا پڑا۔ اور پھر رو دیتا۔

رامو جب اپنے گھر کی چہل پہل کی یا اس کی تباہی کی باتیں کرتا تو مومنہ کو ایسا محسوس ہونے لگتا گویا میں یہ سب کچھ دیکھ چکی ہوں۔ میرے سامنے رامو کی ماں منہ اندھیرے اٹھ کر گھر صاف کرتی اور سامنے کے دالان میں چوکا لیپتی اور جب سب بچے سو کر اٹھتے تو ان کو لسّی بنا کر دیتی پھر دوپہر کو سب کو اسی دالان میں بٹھا کر ان کے آگے تھالیاں رکھ کر ان میں دال اور ترکاریاں پروستی۔ اور پھر گرما گرم روٹیاں دیتی جاتی اور لوگ کھاتے جاتے۔ بچے اچار کے لئے ضد کرتے تو بغل کی کوٹھری میں جا کر ہانڈی اٹھا لاتی اور اس میں سے اچار کی پھانکیں نکال نکال کر ایک ایک سب کو دیتی۔ چھوٹا چندر کہتا کہ میری پھانک چھوٹی ہے اور جب تک وہ رامو سے زیادہ نہ لے لیتا نہ مانتا۔

رامو نے جب پچھلی دیوالی کی باتیں کیں تب بھی مومنہ کو ایسا لگنے لگا گویا سب کچھ اس کے سامنے ہوا تھا۔ رامو کی ماں نے دیے جلا کر سب کو دیے تھے اور جب چندر اپنے مٹھائی کے سب کھلونے چٹ کر گیا اور پھر رامو کا شیر چھیننے لگا اور اس کے لئے ضد کرنے لگا تو ماں نے رامو کو سمجھا بجھا کر اس کا شیر چندر کو دلا دیا تھا۔ رامو نے شیر تو دے دیا لیکن حسرت سے

اس کی طرف تکتا رہا۔

صرف اتنا ہی نہیں، آباد گھر کا پورا نقشہ مومنہ کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا۔ دالان، کمرے اور بیٹھک سب بھرے پُرے نظر آنے لگتے۔ بچے، مرد اور عورتیں اِدھر سے اُدھر آجا رہے ہیں۔ رامو کی ماں انتظام میں لگی ہوئی ہے ایک دالان سے دوسرے دالان میں اور اس دالان سے کمرے میں۔ اور کمرے سے کوٹھری میں اور پھر رسوئی میں آجا رہی ہے۔ ہر بات کی فکر ہے۔ بھینس دوہی گئی۔ جو دودھ آیا تھا وہ آگ پر کیوں نہیں رکھا گیا؟ دہی جما دیا یا نہیں؟ نوکروں کو کھانا بھجوا دو۔ چندر! اتنا نہ شور کرو۔ رامو کمرے میں جاؤ اور سبق یاد کرو۔" باہر کہار کسی بات کے لئے چلا رہا ہے۔ حاطے میں بیلوں کو سانی دی جا رہی ہے۔

گھر کی تباہی کا حال مومنہ یوں دیکھتی کہ احاطے کی طرف کے پھاٹک پر حملہ ہوتا ہے۔ رامو کی ماں رامو اور چندر کو لے کر بھاگنے کی فکر میں ہے۔ کہ حملہ آور اندر گھس آئے ہیں۔ رامو کی ماں شیرنی کی طرح اپنے بچوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے ــــــ چندر اور رامو مظلومی سے ماں ماں پکارتے ہیں ــــ ساتھ ہی مومنہ کو شمس و قمر کا مارا جانا اور لاڈلی کا پٹک دیا جانا یاد آجاتا۔

مومنہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ رامو کی ماں اور میں۔ چندر و رامو، شمس و قمر دونوں گھرانوں کی آبادیاں اور بربادیاں ہیں۔ وہی تاش کے باون پتے، صرف پھینٹ دینے سے بازیاں بدل گئی ہیں۔ اپنے نئے احساسات پر اسے حیرت ہوتی تھی کہ کہاں میں مسلمان اور کہاں وہ ہندو؟ ہم دونوں کیوں کھچڑی کے دال چاول کی طرح مل گئے ہیں۔

کہیں مجھے کچھ ہو تو نہیں گیا ہے۔ لیکن اس کی وہ ماںتا جس نے رامو کو کلیجے سے لگا لیا تھا یقین دلا دیتی تھی کہ نہیں بھولی۔ تو پہلے سے بہتر ہو گئی ہے۔

اگر کہیں مومنہ اپنی اس تبدیلی کو سمجھ لیتی تو پھر وہ یہ بھی سمجھ لیتی کہ وہ کیوں ایکا ایکی رامو پر جان چھڑکنے لگی۔

ایک چلتی ہوئی گھڑی تھی جو کائنات کی حرکت و عمل میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ لیکن نفرت کی بھٹی نے اسے پگھلا کر مٹی میں ملا دیا۔ ایک پرزہ جو بچ گیا تھا۔ غموں سے چھلنی دل کو لئے خزاں مارے پتے کی طرح ادھر سے ادھر اور اُدھر سے اِدھر مارا مارا پھر رہا ہے۔ نہ کوئی ایسا ہے جو اس سے رشتہ جوڑے اور نہ ایسا جس سے وہ رشتہ توڑے۔ نہ کوئی ٹھور نہ ٹھکانا۔ نہ اور چھور۔ نہ مصرف نہ عمل۔ اس کے لئے آبادیاں بھی ایسا چٹیل میدان ہیں جس میں گھاس کا ایک تنکا تک نہیں۔ کیا اس پرزے کے دل میں یہ حسرت نہ ہوگی کہ میں پھر کسی مشین میں لگ جاتا۔ ایسی مشین جو مجھے سمو لیتی اور جس میں میں کھپ جاتا۔ کیا یہی حسرت اب اس کی کل زندگی نہ ہوگی؟ کل زندگی یہ حسرت نہ ہوگی تو پھر کیا ہوگی؟

مومنہ ایک ایسا ہی پرزہ تھی اور وہ خزاں مارے پتے کی طرح ماری ماری پھر رہی تھی۔ نہ اس سے کوئی محبت کرنے والا تھا اور نہ ایسا جس سے وہ محبت کرے۔ کوئی ایسا بھی نہ تھا جو اس کا دکھڑا ہی سن لیتا۔ لے دے کر ایک بہن کی یاد تھی لیکن وہ بھی شکوک کے درجنوں غلافوں سے ڈھکی ہوئی تھی کہ پتہ نہیں بہن زندہ بھی ہے یا نہیں؟ اور اگر زندہ ہے تو کیا معلوم اس سے کبھی ملنا ہوتا ہے یا نہیں۔ بھلا ایسی یاد زندگی کی ناؤ کھے سکتی ہے؟

رامو کا مکان مومنہ کے مکان سے ملتا جلتا تھا۔ پھر اس فضا میں آئی آشنا اپنی محبت لے کر ان دونوں چیزوں نے مومنہ کی مامتا کو شدت سے کھینچ لیا اور پھر ان دونوں کن ڈک رڈوں کو پاتے ہی وہ خود بخود رامو تک پہنچ گئی۔ اگر زندگی کہیں اتنی تنگ دامن ہو جاتی کہ مومنہ کو ایک کنبا اور ایک چھوکرا تک محبت کے لئے نہ ملتا تو یہ بات امکان سے بعید نہ تھی کہ وہ پھر کو بیٹی بنا لیتی۔ زندگی کے یہ فارمولے حساب کے فارمولوں سے کم جبری نہیں۔

(۸)

ایک مرتبہ رامو اپنے گھر کی تباہی کا حال بیان کر رہا تھا اور ایسا سہما ہوا تھا گویا اس وقت بھی وہ کھپریل کی آڑ میں کوٹھے پر چھپا ہوا ہے اور ڈر رہا ہے کہ کہیں مجھ پر بھی کوئی حملہ نہ کر دے۔ مومنہ نے ڈھارس دینے کے لئے اسے پیار کیا اور سمجھایا کہ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جاؤ۔ اس ڈھارس پر وہ اپنے پتا جی، دادی، چندر، چھوٹی بہن اور ننھے بھتیجے ایک ایک کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دیر تک روتا رہا۔ جب ذرا سکون ہوا تو کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

'ماں'

ہاں رامو'

"سب مسلمان حملہ آور یہیں پاکستان میں ہوں گے"!

"پاکستان؟"

ہاں وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ اب یہ جگہ پاکستان میں شامل ہے۔

"پھر ضرور یہاں ہوں گے"!

"ماں"

"کہو رامو"

میں جب اچھا ہو جاؤں گا تو دو کام کروں گا۔ ایک تو ہوائی جہاز اڑانا سیکھوں گا۔ اور دوسرے بم بنانا۔

مومنہ اس خوفناک خیال کو کچھ بھانپ گئی۔

"پھر کیا کرو گے بیٹا؟"

"میں بہت سے بم ہوائی جہاز پر رکھ کر اڑ جاؤں گا اور جہاں دیکھوں گا کہ کسی مسجد میں بہت سے مسلمان جمع ہیں ان پر بم گرا دوں گا اور اڑ جاؤں گا بم گرے گا دھم۔ کسی کا کان اڑ جائے گا۔ کسی کی ناک اڑ جائے گی۔ کسی کا سر اڑ جائے گا۔ کسی کا تو ندہ چیتھڑے چیتھڑے ہو جائے گا۔ کوئی روئے گا کوئی ہائے ہائے کرے گا۔ کوئی اللہ کو پکارے گا۔"

رامو اس تصور سے مست ہو گیا اور کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ رامو پر زندگی کی تلخ حقیقتیں، نفرت، انتقام، قتل، موت، لاوارثی کی زندگی، یہ سب اپنے پورے بوجھ کے ساتھ پھٹ پڑی تھیں۔ اور اس کا معصوم بچپن ان کے نیچے کچل کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ وہ دوسروں کو ایذا پہنچانے اور قتل کرنے کی باتیں اس طرح کرتا گویا میچ میں وہ دوسری ٹیم کو ہرانے کے منصوبے باندھ رہا ہو۔ اس سے بھی زیادہ المناک بات یہ تھی کہ اس کی تہ میں پورا عزم ہوتا تھا۔

مومنہ یہ دیکھ کر کہ رامو کے اندر انتقامی بارود بھری ہوئی ہے سہم گئی۔ پھر پیار سے کہنے لگی:۔

"نہیں رامو ایسا نہ کہو۔ مسلمانوں میں بڑے بھی ہوتے ہیں اور

بھلے بھی:"

جس وقت رامو انتقام کی باتیں کر رہا تھا تو اس پر خوف اور دہشت کی بجائے مسرت اور عزم کے جذبات آ گئے تھے لیکن ماں کی زبان سے ایسی باتیں سنتے ہی بے حد سہم گیا۔ اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"ماں"۔

مومنہ اس کا سہما دیکھ کر گھبرا گئی۔ پھر اپنے کو سنبھال کر پیار سے بولی۔

"کیا بات ہے رامو؟"

"ماں"

"ہاں رامو کہو نا؟"

"ماں ـــــ تم مسلمانوں کی طرفداری کرتی ہو؟"

مومنہ کو محسوس ہوا کہ اگر میں نے کہیں طرف داری پر اصرار کیا تو بچہ مجھے بھی غیر سمجھنے لگے گا اور پھر مصیبتوں کے بوجھ اور تنہائی سے اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ کچھ مومنہ کو یہ بھی اندیشہ ہوا کہ کہیں رامو بھانپ نہ لے کہ میں اس کی ماں نہیں ہوں۔

"تم مجھ سے کیوں ہٹ گئے رامو"

"تم مسلمانوں کی طرفداری جو کرتی ہو"

"کہاں طرفداری کرتی ہوں؟"

"طرفداری نہیں کرتی ہو؟"

"نہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ان میں سے کچھ اپنے کو بھلا بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن ہوتے سب ایسے ہی ہیں۔"

مومنہ نے بات بنا دی اور رامو کو سمجھاتی رہی۔ پھر بھی رامو دیر تک

ماں سے الگ الگ رہا

راموکے دل میں مسلمانوں سے انتقام لینے کی یہی ایک صورت نہیں تھی۔ ایسی ایسی درجنوں صورتیں تھیں۔ جن سے وہ مزے لیا کرتا تھا کبھی سوچتا کہ میں بہت سے ہندو لڑکوں کو جمع کر کے ڈاکو بن جاؤں گا۔ اور مسلمانوں کو لوٹ لوٹ کران کا پیسہ ہندوؤں کو دیا کروں گا۔ اور کبھی یہ سوچتا کہ میں زہر لے کر راتوں کو مسلمانوں کے گاؤں میں چلا جایا کروں گا اور کنوؤں میں ڈال دیا کروں گا۔ بس وہ پانی پئیں گے اور سب کے سب ایک ساتھ تڑپنے لگیں گے۔ کوئی پانی تک دینے والا نہ ہو گا۔

راموکے منہ سے ایسی باتیں سن کر مومنہ کو اس سے نفرت ہو جانا چاہیئے تھی۔ لیکن مامتا نے اسے ایسے عالم میں پہنچا دیا تھا کہ وہ یہ باتیں سن کر ترس کھاتی تھی کہ ہائے حملہ کرنے والوں نے میرے رامو کے جسم ہی کو نہیں دماغ کو بھی پھونک دیا ہے۔ وہ راموکو لپٹا لیتی اور اپنے دو ایک آنسو اس کی انتقامی آگ پر چھڑک دیتی۔

(۹)

حملہ آوروں نے اناج اٹھانے میں بہت لاپروائی سے کام لیا تھا اس وجہ سے گھر میں مٹکے کے علاوہ جگہ جگہ پر چنے اور گیہوں بکھرے ہوئے تھے جن میں اکھوے پھوٹ آئے تھے۔ چڑیاں ان کو بارش کی اور آشنا کی وجہ سے ختم نہ کر سکی تھیں۔ اور چوہے یا تو سب آگ میں جل گئے تھے یا بھاگ گئے تھے۔ مومنہ نے اناج کو بٹورا تو ڈھائی سیر کے قریب نکلا۔ اس اناج کو مومنہ خود کھاتی تھی اور اپنی چھاتی کا دودھ راموکو پلاتی تھی۔

مومنہ نے اپنی شلوار کے دونوں پائچے پھاڑ کر الگ کر لئے۔ ایک کو الٹ کر لنگے یا پیٹی کوٹ کی طرح خود پہن لیا اور دوسرے کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کئے اور ان کا رامو کا بچھونا بنا دیا۔ اور دوپٹے کو دوگر کے اوڑھنے کی دو چادر بنا دیں تاکہ مکھیاں اسے تنگ نہ کریں۔ جب اس اوڑھنے بچھونے کا ایک جوڑا رامو کے جسم سے بہنے والے پانی سے تر ہو جاتا تھا تو مومنہ اسے دھو کر سوکھنے کو پھیلا دیتی اور دوسرا جوڑا بچھا اڑھا دیتی تھی۔ جب رات کو خنکی ہوتی تھی تو سب کچھ رامو کو اڑھا دیتی تھی اور خود بھی اسے لپٹا لیتی تھی۔

رامو جب بھی اپنی ماں کا دودھ پیتا تو پہلے سے زیادہ اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ اس سے بن نہیں پڑتا تھا کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرے۔ بس وہ مومنہ کے گلے میں باہیں ڈال کر ماں ماں کرتا اور اپنی خالی آنکھوں سے اس کے چہرے پر محبت اور شکرگزاری کی بارش کرتا۔

مومنہ رامو کے علاج کے لئے بہت متفکر تھی لیکن علاج کہاں سے میسر آئے۔ اس کو جلنے کی جو جو دوائیاں معلوم تھیں ان میں سے ایک بھی یہاں نہیں مل سکتی تھی۔ ایسی حالت میں بس دو صورتیں تھیں ایک تو یہ کہ مومنہ رامو کو لے کر کسی پاس کے دیہات کو چلی جائے شاید کوئی بھلا مانس ترس کھا کر ان دونوں کو نکالے اور علاج کر دے یا کرا دے۔ سو یہ صورت یوں ممکن نہ تھی کہ رامو اتنا جلا ہوا تھا کہ اسے گود میں اٹھانا مشکل تھا اور مومنہ میں اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اسے لے کر کوس دو کوس جا سکے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اسی گاؤں میں

بسنے کے لئے کچھ لوگ آجائیں اور وہ ترس کھا کر راموُ کے علاج کا انتظام کردیں۔ بس یہی امید تھی جس پر وہ جی رہی تھی۔ لیکن پہلا دن گزرا۔ دوسرا دن گزرا، تیسرا دن گزرا، چوتھا دن گزرا۔ پر گاؤں میں بسنے کے لئے نہ تو ہندو آئے اور نہ مسلمان، وہ متحیر تھی کہ آج کل جبکہ لاکھوں انسان بے گھر ہو کر مارے مارے گھوم رہے ہیں، اس گاؤں کو جس کے کھیت کھڑے لہلہا رہے ہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگست اور ستمبر ۱۹۴۷ء کا زمانہ پنجاب اور اس کے آس پاس کے مقاموں کے لئے ایسا ہنگاموں اور افراتفری اور بدنظمی کا زمانہ تھا کہ پاکستان کے ایک گاؤں کا جو ہندوستان کی سرحد پر شاہراہ سے ہٹ کر واقع تھا، خانماں برباد لوگوں کی اس کثرت کے باوجود خالی رہ جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ سکھوں یا ہندوؤں کے وہاں بسنے کا اس دور میں کوئی امکان ہی نہ تھا۔ رہے مسلمان پناہ گزیں سو وہ مخصوص راہوں سے گزرتے تھے اور جو خالی مقام مل جاتا تھا جسے خالی کرایا جا سکتا تھا وہاں بس جاتے تھے۔ لیکن کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے ان کو دور دراز کے خالی مقاموں کی خبر مل سکے۔ گاؤں کے آس پاس کے مسلمانوں کو خبر تو مل گئی ہو گی۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ خبر پاتے ہی وہ اس گاؤں میں آجاتے یا اگر آجاتے تو بس بھی جاتے۔ بسنے کے لئے بھی تو سو طرح کے انتظاموں کی ضرورت ہوتی ہے جن کا حاصل کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ ان انتظاموں کے نہ ہونے کی وجہ سے نہ آئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی حفاظت میں یا اپنے پڑوسیوں کو لوٹنے میں ایسے منہمک ہوں کہ ادھر توجہ دینے کی نوبت

ہی نہ آئی ہو، ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس کافی ہتھیار نہ ہوں، اس وجہ سے وہ ہندوستان کی سرحد کے قریب بستے ڈرتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مومنہ کے آنے سے پہلے وہاں آئے ہوں اور گاؤں کو جلا ہوا اور بسنے کے ناقابل پاکر وہ یہاں کی بچی کھچی چیزوں کو لے کر چلے گئے ہوں۔ کھیت ضرور چھوڑنے والی چیز نہ تھے۔ سو ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ان کو آپس میں تقسیم کر لیا ہو۔ لیکن قبضہ کرنے کو ہنگاموں کے سرد ہونے پر اٹھا رکھا ہو۔

مومنہ کو کوئی شخص ادھر سے آتا جاتا بھی نظر نہ آیا۔ لیکن یہ بھی کوئی عجیب بات نہ تھی۔ اس دور میں سفر کرنے والے یا تو ہندو سکھ اور مسلمان پناہ گزیں ہوتے تھے یا ان دونوں کو لوٹنے والے مجاہدین اور سورما۔ یا ان کی حفاظت کرنے والے فوجی۔ ان کے علاوہ اور کوئی شخص سفر کرنے کی خاص کر سرحد کے علاقوں میں ہمت ہی نہیں کرتا تھا۔ ایسی صورت میں ایک گاؤں جو شاہراہوں سے دور سرحد پر واقع تھا۔ اگر آنے جانے والوں سے خالی رہا تو کوئی خلاف معمول بات نہیں ہوئی۔

(۱۰)

چاردن کی چاندنی راتیں گزر چکی تھیں اور اب اندھیرا پاکھ تھا جسے بار بار آنے والی گھٹائیں اور مہیب بنا دیتی تھیں۔ جلے ہوئے دالان کے سامنے جلی ہوئی کھیریل کا اژدم تاریکی کا پہاڑ بن گیا تھا۔ گھر کے ہر دروازے، ہر در اور ہر کھڑکی کے اندر اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اتنا اندھیرا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ابلنے ہی والا ہے اور ابل کر سارے عالم کو بھر دے گا۔ لاشوں کو کھانے والے جانوروں کی چیخ پکار اب جو آتی تھی تو

بسی ہوئی، جو دل میں طرح طرح کے ہول پیدا کرتی تھی۔ اس اندھیرے میں صرف آشا کی آنکھیں تھیں جو چمکتی تھیں اور جس سے ذرا ڈھارس بندھتی تھی کہ شاید وہ آنے والی ناگہانی کا مقابلہ کریں۔

مومنہ نے رامو کو اپنے جگر کا خون جو پلایا تو اس میں توانائی کچھ ضرور آئی لیکن جب بخار بڑھا اور زخم بگڑا تو توانائی جو گئی کمزوری میں تبدیل ہو گئی۔ دو دن میں وہ بہت چڑچڑا اور ضدی ہو گیا۔ وہ نمکین چیز مانگتا تھا اور کہتا تھا کہ گاؤں میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہوگی، تم ڈھونڈتی نہیں ہو۔ اس کے پاس ایک کاٹھ کا گھوڑا تھا جو بیٹھکے کے برابر والے دالان میں رہتا تھا۔ رامو کہتا تھا کہ اسے مسلمان لے نہیں گئے ہوں گے۔ انہوں نے کہیں پھینک دیا ہوگا۔ اسے ڈھونڈ لاؤ۔ ساتھ ساتھ اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ماں ذرا دیر کے لئے بھی اس کے پاس سے ہٹ جائے۔ جہاں ذرا دیر کے لئے مومنہ اسے چھوڑتی وہ رونے لگتا اور پھر اسے اپنا باپ، چندر، دادی، گھر آنکھیں سب کچھ یاد آجاتا۔

مومنہ رامو کی تکلیف کو سمجھتی تھی۔ جس بچے کا آدھا جسم ایک آبلہ ہوا ور ہر وقت ٹپکتا رہتا ہو اس کی کیا حالت ہونی چاہیئے۔ بہادر تھا رامو جو اتنا ضبط کرتا تھا۔

آج مومنہ کو آئے پانچویں رات تھی کہ رامو کو اختلاج کا سخت دورہ پڑا اور وہ سب گزری ہوئی باتیں یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مومنہ نے منہ دھلایا، پانی پلایا۔ دل میں دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کیں، بہت دیر میں جاکر اس کی حالت کچھ سنبھلی۔ تب بہلانے کو

مومنہ نے اسے کل کے گھوڑے کی کہانی سنائی۔ کہانی سن کر رامو بولا۔

"ماں! اگر میرا کاٹھ کا گھوڑا اُڑ جائے اور وہ اُڑنے لگے تو کیا مزہ آئے۔"

"ہاں بیٹا پھر تم جہاں چاہو اُڑ کر پہنچ جاؤ۔"

"ماں پھر میں اس پر تم کو بٹھا کر ماما جی کے یہاں پہنچ جاؤں اور ان کے دروازے پر نہیں بلکہ کوٹھے پر اتروں اور ہم دونوں زینے سے اتر کر نیچے آئیں۔ ماں پھر ماما جی اور نانی جی کو کتنی حیرت ہوگی؟"

رامو کو اس خیال سے لطف آگیا اور وہ ہنس پڑا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"اگر ایسا گھوڑا ہوتا تو میں ایک کام اور کرتا۔"

"وہ کیا؟"

"وہ یہ کہ اس پر جا کر کسی سلمان کو اٹھا لاتا اور پھر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی کنوئیں میں لٹکا دیتا۔ اور کہتا "کہو بچا جی اب ملا مزا ہندوؤں کو مارنے کا۔"

رامو کے منہ سے پھر زہر کے بھپکے نکلنے لگے اور پھر وہ ہوائی جہاز اور بم والی باتوں کے رنگ میں آگیا۔ مومنہ اب ایسے موقع پر ہاں ہاں کر دیا کرتی تھی لیکن کنوئیں میں لٹکانے کی بات سن کر اپنے شوہر کا کنوئیں میں زندہ دفن کیا جانا یاد آگیا اور وہ باوجود کوشش کے ہاں میں ہاں نہ ملا سکی۔

رامو۔ "کیسا اچھا ہوتا ماں!"

مومنہ خاموش رہی لیکن وہ ڈرتی بھی رہی کہ کہیں اس خاموشی سے

رامو خوفزدہ نہ ہو جائے۔ یا اسے اختلاج کا دورہ نہ پڑ جائے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ رامو کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

پچھلے پہر رامو کی حالت بگڑ گئی۔ مومنہ کے پاس دوا کے نام کو صرف گڑھے کا برساتی پانی تھا یا دعا — یوں تو جب تک رامو کی سانس تھی تب تک مومنہ کی آس تھی۔ لیکن اس کی زبان سے نکل گیا۔"ان تینوں کا جیسا کچھ دیکھا یہ بھی دیکھ۔ حالت کی خرابی کوئی چھ سات گھنٹہ تک رہی مومنہ اس کا سرا اپنے زانو پر لئے کیفیت دیکھتی رہی، دعائیں مانگتی رہی اور قرآن کی آیتیں پڑھ پڑھ کر دم کرتی رہی۔

ذرا دن چڑھے رامو نے خلاف توقع آنکھیں کھول دیں اور نحیف آواز سے پانی مانگا۔ مومنہ نے پانی دے کر پوچھا۔

"بھوکے بھی تو ہو گے؟"

"ہاں ماں"

مومنہ نے رامو کے منہ میں چھاتی دے دی۔ اس نے منہ میں لے تو لی لیکن پیا نہیں۔ وہ صرف ماں کی قربت کا بھوکا تھا۔ اس نے کوشش کر کے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور کہا۔

ماں اگر میں بچ جاؤں تو جانتی ہو کیا کروں گا۔

"کیا کرو گے بیٹا؟ — تم بچ جاؤ گے"

"ماں میں زندگی بھر تمہاری سیوا کروں گا۔ اپنی زندگی کا ایک ایک پل اسی میں خرچ کروں گا۔ میں پڑھوں گا۔ لکھوں گا جو کچھ بھی کروں گا تمہارے لئے کروں گا — تم کو ہر وقت دودھ دہی کھلاؤں گا تم کو اپنی جگہ سے ہلنے نہ دوں گا۔ ہر کام خود دوڑ دوڑ کر کروں گا۔"

مومنہ کے گالوں پر آنسوؤں کا ہار گندھ گیا۔ اس نے اپنی آواز کو سنبھال کر کہا۔

"ہاں بیٹا تو بڑا پیارا ہے۔ تو ایسا ہی کرے گا"

رامو پر پھر کمزوری طاری ہو گئی۔

"ماں"

"بیٹا"

"مسلمان اپنے مردوں کو دفن کر دیتے ہیں"

"ہاں رامو"

"لاش زمین کے اندر سڑتی ہو گی اور اسے کیڑے مکوڑے کھاتے ہوں گے۔ یہ بھی کتنا برا طریقہ ہے۔ ہم لوگ تو پھونک کر سب کچھ اپنے سامنے ختم کر دیتے ہیں"

مومنہ اب تک سمجھتی تھی کہ لاش کا پھونکنا بے حد غیر مہذب طریقہ ہے اور دفن کرنا بہت شائستہ فعل ہے۔ یہ نیا نقطۂ نظر سن کر وہ متحیر ہو گئی لیکن اس نے سوچا کہ اس طرح بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

پھر رامو پر کمزوری طاری ہو گئی۔

"ماں"

"ہاں بیٹا"

کیا مرنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے؟"

اس سوال پر مومنہ کی مامتا تڑپ اٹھی لیکن اس کی ہمت نے کہا مومنہ! اپنے بچے کو آخری بار تراکے لئے تیار کرنا ہے، وہ کلیجہ پکڑ کر بولی

"نہیں رامو، تکلیف صرف ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کے دل ہیں

برائی ہوتی ہے۔"

"ماں، کیا میرے دل میں برائی ہے؟"

"پیارے تیرا من تو ہیرا ہے۔"

"سچ"

"ہاں بیٹا!"

"رام . . . . . "

"مگر رامو مرنے کی باتیں نہ کرو۔ تم تو اچھے ہو جاؤ گے!"

"رامو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"ماں"

"ہاں بیٹا!"

ایک بات پوچھوں!"

"ضرور"

"بتا دینا!"

"ہاں ضرور بتا دوں گی!"

"ماں کیا تم مسلمان ہو؟"

یہ سوال بالکل خلاف توقع تھا۔ مومنہ سناٹے میں آگئی۔ کیا رامو نے شروع ہی سے پہچان لیا تھا اور اب تک مجھے دھوکے میں رکھا؟ لیکن نہیں، اب تک تو وہ مجھے ماں ہی سمجھتا رہا ہے۔ اس کی باتوں میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ پھر کیا بات ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مرتے وقت جو ایک حقیقت بینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ رامو میں پیدا ہو رہی ہے۔

رامو خود ہی کہنے لگا۔
"ماں کچھ ایسا لگتا ہے کہ میں نے اودبدا کر بہت سی باتوں کو نہیں سمجھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم میری ماں ہو تیں، اس لئے میں نے سمجھ لیا کہ تم میری ماں ہو۔ لیکن اب چھلکا اتر گیا اور بات سمجھ میں آنے لگی ہے۔ ماں تم نے مجھ سے جیسی محبت کی ہے سگی ماں نے بھی نہیں کی تھی۔ مجھے ایسا سکھ کبھی نہیں ملا تھا۔ پچھلے جنم میں تم ہی میری ماں ہو گی۔
مومنہ: "ہاں بیٹا میں مسلمان ہوں۔"
"ماں مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ اب میں ڈروں گا نہیں۔ تمہارا گھر کہاں ہے اور تم یہاں کیسے آئیں؟"
"میرا گھر دہلی کے پاس تھا سب کچھ لوٹ لیا گیا۔ عزیز مار ڈالے گئے۔ اور مجھے لوگ پکڑ لے گئے۔ پھر موقع پاکر میں بھاگ آئی اور یہاں پہنچ گئی۔"
"لوٹنے والے کون تھے۔ ہندو۔"
"ہاں بیٹا ہندو تھے۔"
رامو کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔
"میرے بھائی بہن بھی ہیں؟"
"دو بھائی ایک چھوٹی بہن مار ڈالے گئے، ایک جوان بہن باقی ہے۔"
"کہاں ہے؟"
"پتہ نہیں۔"
"ہندو اٹھا لے گئے؟"
"ہاں۔"
رامو کے دل پر سخت گھونسا لگا۔ اور منہ سے آہ نکل گئی۔

"ماں اگر تم بدلہ لے سکیں تو ہندوؤں سے بدلہ لوگی؟"
"دیکھتا نہیں ہے مورکھ، میں تجھے کتنا پیار کرتی ہوں۔"
راموکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگا۔ "شما کرو، ماں۔ مجھ سے بھول ہوئی۔ تم بدلہ لینا چاہتیں تو مجھ سے نہ لے لیتیں۔ تمہارے دل میں تو دیا ہی دیا ہے۔"
راموذرا کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر کہنے لگا۔ "اگر میں بچ گیا تو میں بھی اب بدلہ نہ لوں گا۔ اپنی بہن مہرن کو ڈھونڈ کر لاؤں گا۔"
"بیٹا تو ضرور ایسا کرے گا۔ تو بڑا اچھا ہے۔ میرا راموتو ہیرا ہے۔"
"میری ایک کامنا اور پوری کر دو ماں۔"
"کیا؟"
"تم میرے مرنے کا غم نہ کرنا میری آتما اسی وقت شانت ہوگی جب تم سکھی ہوگی۔ ماں تم نہیں سمجھ سکتیں کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔"
مومنہ نے پتھر کا دل کر کے جواب دیا۔
"میں صبر کروں گی۔ لیکن تو اچھا ہو جائے گا۔"
"ہمارے گاؤں میں سب سے مضبوط چیز وہ پتھر ہے جس پر شوالہ بنا ہے تم مجھے ویسی ہی مضبوط معلوم ہوتی ہو ماتاجی۔ تم جو چاہو وہ کر سکتی ہو۔ میری ماں کا نام پریما ہے۔ باپ کا نام سورج پرشاد۔ انہیں برے مسلمان پکڑ لے گئے ہیں۔ ہو سکے تو انہیں بھی میری بہن مہرن کے ساتھ ڈھونڈنا۔"
"میں بے بس عورت ہوں۔ نہ پیسہ ہے اور نہ کوئی مددگار۔ لیکن جو کچھ کر سکتی ہوں ان دونوں کو چھڑانے کے لئے کروں گی۔ جو محبت میں تجھ سے کرتی ہوں وہی پریما سے کروں گی۔ تم شانت رہو بیٹا۔"

"ایک بات اور ہے ماں ۔ تمہارا جی چاہے تو مجھے دفن کر دینا میں تمہارا ہی بیٹا ہوں ـــ ایشور کرے دوسرے جنم میں تم ہی سے پیدا ہوں ۔ اور تم ہی مجھے پالو پوسو۔"

بجھتا ہوا چراغ لمحہ بھر کے لئے اس طرح بھڑک کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

مومنہ واقعی شولے کا پتھر بن گئی ۔ وہ یسین پڑھتی رہی اور جب رامو چلا گیا تو اس نے اپنی شلوار کی بنائی ہوئی چادروں کو دھو کر اسے کفن دیا وہ اکیلی نہ اس لاش کو دفن کر سکتی تھی اور نہ پھونک سکتی تھی ۔ لیکن اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اس کے بچے کو مرنے کے بعد جنگلی جانور اپنا لقمہ بنائیں ۔ اس لئے اس نے لاش اٹھا کر بیٹھکے میں رکھ دی ۔ اور اس کی دیوار پر کوئلے سے لکھ دیا ۔

"یہ لاش رامو کی ہے ، وہ ہندو تھا لیکن اس کی ماں مومنہ مسلمان تھی ۔ اگر یہاں مسلمان آئیں تو اسے دفن کر دیں ۔ ہندو آئیں تو پھونک دیں ۔ مومنہ اگر زندہ بچی تو یہ احسان کرنے والے کا شکریہ ادا کرنے یہاں ایک بار ضرور آئے گی ۔"

مومنہ نے بیٹھکے کے سب دروازے بند کر دیئے ۔ اور دہلیز پر چند جنگلی پھول لا کر چڑھا دیئے ۔

اس اجڑے گاؤں میں مومنہ کی ایک سہیلی اور تھی اور گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ اس کی بھی عیادت کر لینا چاہتی تھی ۔ یعنی بھینس ۔

مومنہ وہاں گئی اور کھنڈر پر چڑھ کر اس نے جھانکا ۔ پانی سوکھ چکا تھا ۔ اور ماں اور بچھڑے کی لاشیں ایک دوسرے سے اس طرح گتھی ہوئی پڑی تھیں گویا وہ دو جسم نہیں ایک ہی جسم تھے ۔

مومنہ وہاں سے رخصت ہو کر جب گاؤں سے نکلنے لگی تو آشا اس کے ارادے کو بھانپ کر رک گئی اور التجا بھری نظروں سے مومنہ کو دیکھنے لگی۔ وہ یہ کہہ رہی تھی کہ میں رامو کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی مجھے معاف کرو، میں تو اس کی سمادھی پر جوگن بن کر رہوں گی۔

آشا اب پہلے والی آشا نہ تھی وہ نراشا ہو گئی تھی۔ مومنہ نے اس کو چمکارا اور پیار سے سمجھایا۔

"بھولی بھالی آشا کیا تو سمجھتی ہے کہ رامو وہ تھا جسے میں بٹھکے میں چھوڑ آئی ہوں وہ تو ایک بیکار سی چیز تھا۔ اصلی رامو تو اب میرے من میں ہے اور کہتا ہے کہ تم دھرم اور پریما کی کھوج میں نکلو جب تک تم ان کی کھوج میں لگی رہو گی میں تمہارے من میں رہوں گا اور جہاں تم اس سے غافل ہوئیں میں چلا جاؤں گا۔ چل آشا تو اگر رامو سے پریم کرتی ہے تو میرے ساتھ آ۔"

آشا سمجھی یا نہیں، لیکن مومنہ کے ساتھ چل کھڑی ہوئی۔ گاؤں کو طے کر کے مومنہ شوالے کے سامنے آگئی اور وہ پتھر دیکھنے لگی جس سے رامو نے اس کو تشبیہ دی تھی۔ واقعی وہ ایک زبردست لمبی چوڑی چٹان تھی جو اپنے سینے پر شوالے یا مسجد کو اٹھائے ہوئے تھی جانے کب سے اٹھائے ہوئے تھی اور جانے کب تک اٹھائے رہے گی۔ فسادوں اور آگ و خون کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

مومنہ نے اوپر نیچے دیکھا، پاؤں تلے وہی زمین تھی اور سر پر وہی آکاش جن کے درمیان اس کے سکھ کے دن بیتے تھے اور دکھ کے بھی۔ ان دونوں کے بیچ میں بدستور ہوا کے جھونکے ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان آتے جاتے تھے۔

پتھر وہیں رہ گیا اور مومنہ اسی دھرتی اور اسی آکاش کے بیچ میں اپنی مشن پر چل کھڑی ہوئی۔

بھیک

کیلاش کی لاری بنجور اگرھ کے خشک بنجر اور تپتے ہوئے پہاڑوں کو ایک درے سے پار کر کے موتی نگر کی وادی میں داخل ہوئی۔ اور داخل ہوتے ہی منظر اور موسم اور مسافروں کا مزاج سب کچھ بدل گیا۔ سامنے ایک طرف نندا دیوی اور ترسول کی برف پوش چوٹیاں چمک رہی تھیں اور دوسری طرف ڈھلوان پہاڑوں پر سیب، ناشپاتی اور آلوچوں کے باغوں کی ہریالی تھی جو پہاڑوں کے سلسلوں سے زینہ بزینہ اترتی ہوئی نیچے جا کر گھنے درختوں اور نامعلوم تاریکیوں میں گم ہو جاتی تھی۔

جب لاری اسٹینڈ پر پہونچی کیلاش اپنی بہنوں سمیت اترا تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آج کوئی بہت بڑا تہوار ہے۔ جیسے پہاڑ اور ان کی چوٹیاں درخت اور چڑیاں۔ آسمان اور سورج یہ سب کے سب انسانوں کے ساتھ

مل جل کر منا رہے ہیں۔ اس خوش گوار منظر میں کیلاش ایسا کھویا کہ اسے اپنی سخت بیماری کی وجہ سے زندگی کی طرف سے جو مایوسی تھی وہ بالکل دور ہو گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے آسمان کو چومنے والے پہاڑ اشاروں میں کہہ رہے ہیں کہ ہماری شاندار صاف و شفاف اور دلکش دنیا میں بیماری اور مصیبتوں کا کیا کام۔ لاری اسٹینڈ سے ایک سڑک بل کھاتی ہوئی جھومتی جھامتی آبادی کی طرف جاتی تھی۔ اس نے کیلاش کو ایسا لبھایا کہ وہ نوکر سے جو اسباب کو اٹھوانے میں لگا ہوا تھا یہ کہہ کر کہ "میں ڈاک بنگلے کی طرف چلتا ہوں روانہ ہو گیا۔ راستہ بہت دلکش تھا اور ہر موڑ قدرت کی نت نئی فیاضیوں سے مالا مال تھا۔

کچھ دور نکل کر کیلاش ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ایک پیالی چائے پی کچھ دیر سامنے کے منظر سے لطف اٹھایا اور پھر آگے کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں ایک باغ میں ایک آدمی تازے سیبوں کو چیڑ کے بکس میں بند کر رہا تھا۔ اس کے پاس دو مسافر کھڑے تھے۔ جن میں ایک دس گیارہ برس کی خوبصورت سی لڑکی تھی۔ وہ دونوں پھل والے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

کیلاش ادھر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں پاس سے ایک آواز آئی "بابو جی۔ تھرماس میں لے چلوں ؟" کیلاش نے مڑ کر دیکھا ۔ بارہ تیرہ برس کی دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی اور بڑی بڑی مظلوم اور مایوس آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

تھرماس واقعی کیلاش کو بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے وہ لڑکی کے حوالے کر دیا۔ اور پھر اس فیاضی سے جو قدرت نے اس وادی کے ساتھ

دکھلائی دیتی پوچھنے لگا۔

"کہاں رہتی ہو؟"

لڑکی نے نیچے کی گھنی تاریکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہاں بہت نیچے۔"

"ماں باپ کیا کرتے ہیں؟"

"مر گئے۔"

"تم کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں۔"

"کیوں؟"

"بچہ کچھ نہیں کرنے دیتا۔"

"بچہ۔ کیا تمہارے بچہ بھی ہے؟"

لڑکی اس بدگمانی پر ہنس پڑی اور کہنے لگی۔

"میرا دو برس کا بھائی ہے جو بہت دق کرتا ہے۔ ہر وقت کھانا مانگتا ہے ــــــ رات کو نہ وہ سونے دیتا ہے اور نہ ڈر ــــ"

"ڈر! اس وادی میں کس چیز سے؟"

"میری کٹھریا کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے۔ رات بھر میں ڈرتی رہتی ہوں کہ کوئی آکر ہم کو کھا نہ جائے۔"

کیلاش کے دل میں دیا ابل پڑی۔

"نوکری کرے گی؟"

"کوئی رکھے تو کیوں نہ کروں۔ میں تو بہت محنت سے اس کی سیوا کروں گی۔"

"اچھا میں رکھوں گا تجھے بھی اور تیرے چھوٹے بھائی کو بھی"۔
لڑکی حیرت زدہ ہو کر کیلاش کو دیکھنے لگی۔
"بابوجی — سچ!"
"ہاں سچ — بالکل سچ"۔
لڑکی تھوڑی دیر تک حیرت زدہ رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ کیلاش کے پاؤں پر گر پڑی۔ اور شکر گزاری سے بابوجی بابو جی کرنے لگی۔ اس کے منہ سے اور کچھ نہ نکلا۔

رجنی خوشی کے مارے رات کو سو نہ سکی۔ ذرا ذرا دیر کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی تھی اور ہر بار وہ کروٹ لے کر ٹوٹے کواڑوں کی دراڑوں سے جھانکتی تھی کہ پہاڑوں کے اوپر آسمان پر صبح کی سفیدی تو نہیں نظر آ رہی۔ آج اس کا روزانہ والا خوف کہ کہیں رات کو کوئی بھیانک شکل والی چیز اس کی کوٹھڑی کے ٹوٹے پھوٹے دروازے سے گھس کر اس کو اور اس کے سب بھائی بہنوں کو سوتے میں کھا نہ جائے۔ وہ پہاڑوں میں چھپ گیا تھا۔ اس کے سامنے سکھ سے بھری ہوئی صبح تھی اور پھر عیش و آرام سے بھرے ہوئے دن اور رات۔

رجنی نے اپنے پانچوں بھائی بہنوں پر نظر ڈالی۔ جو کمبلوں کے گودڑ کے نیچے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔

رجنی سوچ رہی تھی کہ ذرا دیر میں صبح ہو جائے گی۔ اور پھر اپنے بھائی بہنوں کو لے کر پانچسو فٹ کی چڑھائی چڑھ کر بابوجی کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ پھر کیا ہے۔ پھر روٹیاں ملیں گی۔ پہننے کو بھی ملے گا اور رات کو

اوڑھنے کو بھی اور ڈر سے بہت دور کسی کوٹھڑی میں سونے کو جگہ ملے گی۔
آخر صبح قریب آہی گئی اور اس کے دو سال کے دبلے پتلے سوکھے ساکھے بھائی للّو نے چیخ مار کر رونا شروع کر دیا۔ آج رجنی نے سستی نہیں دکھلائی اور جلدی سے اسے پیشاب کرا لیا۔ ورنہ ہونا تو یہ تھا کہ وہ یوں ہی دن چڑھے تک پڑا رہتا تھا اور پھر جب اس کا بستر رجنی کو بھیگا ہوا ملتا تھا تو وہ للّو کو دھنک کر رکھ دیتی تھی۔ آج رجنی نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ اسے پیشاب کرا لیا بلکہ اسے پیار بھی کیا اور بہلایا بھی۔ یہ چیز للّو کے لئے کچھ اتنی عجیب سی خوشی لے کر آئی کہ وہ رات بھر کی بھوک کو بھول گیا۔ اور اپنی ٹوٹی پھوٹی بولی میں باتیں کرنے لگا۔
جس وقت موتی نگر کی پچھم کی چوٹیوں پر دھوپ کی پہلی چمک نظر آئی ہے اس وقت تک چھ بچوں کا یہ قافلہ سو فٹ پہاڑ پر چڑھ چکا تھا اور بہت تھک چکا تھا۔ ہوا ٹھنڈی تھی۔ تیز تھی اور مخالف تھی اس وجہ سے بچوں کو خالی پیٹ اوپر چڑھنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ للّو کئی مرتبہ رو چکا تھا اور رجنی کے ہاتھ سے اس پر پیٹ بھی چکا تھا رجنی نے ذرا دیر اسے گود میں بھی لیا تھا۔ لیکن بارہ برس کی لڑکی جسے پیٹ بھر کھانا نہ ملتا ہو کیسے دو سال کے بچے کو لے کر دور تک جا سکتی تھی اس لئے للّو چل سکے یا نہ چل سکے اسے چلنا تو پڑے گا ورنہ رجنی مار مار کر راستے ہی میں ختم کر دے گی۔ اس وقت تو وہ کچلی ہوئی ناگن کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ اسے سخت کوفت تھی کہ یہ دو سال کا ہڈیوں کا ڈھانچہ میں جہاں جاؤں یا جو کام کروں میری راہ میں حائل رہتا ہے۔ اب دیکھو اس وقت عیش و آرام کی دنیا صرف چار سو فٹ اوپر ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا

تو میں کب کی وہاں پہنچ چکی ہوتی۔

رجنی کا غصہ دیکھ کر کلو جو للو سے دو سال بڑا تھا اور منی جو چار سال بڑی تھی سہمے ہوئے تھے۔ اور ہانپ ہانپ کر ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ البتہ تلسی اور رامو رجنی کی طرح تازہ دم تھے بلکہ ان دونوں نے بھی للو کو باری باری گود میں ذرا ذرا دیر کے لئے اٹھا لیا تھا۔

اس طرح چھوٹے موٹے انسانوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ ڈانٹ اور مار، خوف اور آنسو، تھکاوٹ اور ہانپنے، امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ پچاس فٹ اوپر چڑھ گیا۔ اس جگہ رامو کو ایک چشمے کے پاس پڑا ہوا ایک داغی سیب مل گیا۔ لیکن وہ ابھی منہ تک نہیں لے جانے پایا تھا کہ رجنی نے جھپٹ کر اسے چھین لیا اور دانت سے اس کا ایک بڑا سا ٹکڑا کاٹ کر للو کو دیا۔ اور پھر باقی کے دو ٹکڑے کر کے کلو اور منی کو۔

کلو اور منی سیب کا ٹکڑا کھا کر، چشمے سے پانی پی کر تازہ دم ہو گئے اور باتیں کرنے لگے۔

کلو۔ "اوپر پتا اور ماں ملیں گی"

منی۔ "نہیں — اتو — وہ نہیں — وہ تو مر گئے۔"

کلو۔ "جو مر جاتے ہیں کیا وہ اوپر بھی نہیں ملتے؟"

منی۔ (بہت سنجیدگی سے) "وہ کہیں نہیں ملتے۔ ہم لوگ ایک اور بابو جی کے پاس جا رہے ہیں جو پتا جی کی طرح روٹی دیں گے۔ کپڑے دیں گے۔ اور اوڑھنے کو دیں گے۔"

ان دونوں کی باتیں سن کر نہ جانے کیا ہوا کہ رجنی پگھل سی گئی۔ اس نے ان دونوں کو اور پھر للّو کو پیار کیا اور کہا کہ اب دھیرے دھیرے اٹھتے بیٹھتے چلیں گے۔ پھر ڈھارس دینے لگی کہ اوپر پہنچتے ہی بہت سی روٹیاں ملیں گی جن میں گیہوں کی بھی ہوں گی۔ گرم کرتے اور پجامے ملیں گے، چائے ملے گی، سیب ملیں گے، پھر بابوجی کے ساتھ ہم لوگ ان کے دیس چلے جائیں گے۔ جہاں بہت آرام سے رہیں گے۔"

رجنی جس نے آج تک اس وادی کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا تھا پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرف دیکھنے لگی اور سوچنے لگی کہ اس پار کی دنیا کیسی ہوگی مگر جیسی بھی ہو، وہاں روٹیاں ہوں گی، کرتے پجامے ہوں گے اور ایسے گھر ہوں گے جن میں ڈر نہ لگتا ہوگا۔

رجنی اب اپنے قافلے کو لے کر مزے مزے اوپر چڑھنے لگی جتنا جتنا اوپر چڑھتی جاتی اس کی خوشی بڑھتی جاتی۔

رجنی کو معلوم تھا کہ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ پہاڑوں میں گھومنے والے دولتمند کسی پہاڑی مرد یا عورت کو رکھ کر اپنے ساتھ میدان میں لے جاتے ہیں جہاں نہ برف پڑتی ہے نہ بھوک ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات دور دور اس کے تصور میں نہ تھی کہ میں کبھی ان خوش نصیبوں میں ہو سکتی ہوں اور میرے ساتھ میرے پانچ بھائی بہن بھی۔

سورج اوپر چڑھ رہا تھا اور رجنی بھی اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ اوپر چڑھ رہی تھی۔ آخر ڈاک بنگلہ کی سرخ چھت نے اپنی جھلک دکھلا ہی دی۔

کیلاش چائے پی رہا تھا اور کھڑکی سے صاف ستھری نندا دیوی اور اس کے نیچے کے عظیم الشان پہاڑوں کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے نوکر نے آکر خبر دی کہ

"کل والی لڑکی آئی ہے۔"

"اور اس کا بچہ بھی؟"

"ایک چھوڑ پانچ پانچ بچے ساتھ ہیں۔"

"پانچ پانچ!"

نوکر— "جی حضور!"

کیلاش نے باہر آکر دیکھا تو رجنی کھڑی تھی اور اس کے گرد بہت سے چھوٹے بڑے میلے کچیلے، چھپڑے چند ھے بچے، ناک سے سڑ سیڑ گر رہے تھے اور کیچڑ سے لت پت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

کیلاش نے رجنی کے پاس جاکر سختی سے جواب طلب کیا۔

"یہ سب کون ہیں؟"

رجنی کیلاش کو دیکھ کر اتنی خوش ہوئی کہ اس نے اس کی سختی کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کی اور چلا کر کہنے لگی۔

"میں ان سب کو لے آئی اب یہ سب آپ کے پاس رہیں گے یہ منی ہے، یہ للو ہے، وہ رامو ہے، وہ کلو ہے، وہ تلسی ہے۔"

کیلاش "سب تیرے بھائی ہیں؟"

رجنی — جی ہاں، دو بھائی ہیں اور دو بہنیں ہیں۔

رجنی ذرا صاف ستھری تھی اور اس کی صورت میں ایک کشش تھی لیکن بچے تو سڑی گلی چیزوں کا ڈھیر معلوم ہوتے تھے۔ ان کو دیکھ کر

کیلاش کا جی متلانے لگا۔ اور کل والی رومانی فیاضی جو رات گزر جانے سے باسی ہو چکی تھی حقیقت پسندی سے بدل گئی اور کیلاش سوچنے لگا کہ رجنی کے ساتھ ایک بچہ ہوتا دو ہوتے تو ممکن تھا، لیکن اتنوں کو کیسے پالا جا سکتا ہے؟ یہ سب ہمارے چھوٹے سے گھر میں کیسے رہیں گے ان کو کھلایا اور پہنایا کہاں سے جائے گا؟ پھر یہ بہتی ہوئی ناکیں، یہ کیچڑ بھری آنکھیں، یہ کوئلہ ایسے ہاتھ پاؤں، یہ بو اور میل!! کیلاش کی بہنیں بھی باہر نکل آئی تھیں کہ ہم بھی ذرا بھیا کے مہمانوں کو دیکھیں۔ وہ بولیں۔

"بھیا ان سب کو لے چلو گے؟"

کیلاش یہ سوال سن کر جھنجھلا گیا اور رجنی سے کہنے لگا۔

"تو نے کل کیوں نہیں بتلایا کہ تیرے ساتھ اتنی بڑی فوج ہے سب کو میں کہاں رکھ سکتا ہوں؟"

یہ سن کر رجنی پر بجلی گر پڑی۔ اتنی بڑی مایوسی کا سامنا اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سوکھ گیا اور آنکھیں اندر ڈوب گئیں مگر منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ اس کے سب بھائی بہنوں کا بھی یہی حال ہوا۔ کلو تو پھوٹ پھوٹ رونے لگا۔

رجنی نے اپنی گھناؤنی فوج کو نفرت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ایسی نفرت جس کا تقاضا یہ تھا کہ ان سب کو مار ڈالو یا خود مر جاؤ۔

پانچ منٹ کے اندر اندر یہ فوج ناکامی اور نامرادی کو اپنے پھٹے دامنوں میں لے کر پسپا ہوئی لیکن کیلاش کے لئے آسان نہ تھا کہ ان کو یوں رخصت کرنا۔ اس کی دیا جو مر گئی تھی پھر کراہنے لگی اور بکلانے